نگار

قیمت ۸/

نگار

رسالہ ہر مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۶	فہرست مضامین دسمبر ۳۵ء	جلد ۲۸

ملاحظات ———— ۲

حریت فکر اور اشاعت علم کے خلاف مذہب کی جنگ ———— ۹

فلسفۂ محبت ———— سید ابو سعید بزمی۔ ایم۔ اے ———— ۱۴

افسانہ کی تکمیل ———— الیاس اسلامپوری ———— ۳۴

ہندوستان میں متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری ———— بشیر احمد خاں بی۔ اے (علیگ) ———— ۳۷

بعض تاریخی کسبیوں کے خطوط ———— ۴۵

محسن کاکوروی ———— مشیر احمد علوی۔ بی۔ اے۔ کاکوروی ———— ۴۷

ڈھائی سیر آٹا ———— محمد حیات اللہ انصاری۔ بی۔ اے (علیگ) ———— ۵۷

باب المراسلۃ والمناظرہ ———— ۶۹

باب الاستفسار ———— ۷۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸ | دسمبر ۳۵ء | شمار ۶

ملاحظات

ڈاکٹر امبدکر کو کونسا مذہب اختیار کرنا چاہئے

جس وقت سے ڈاکٹر امبدکر نے ہندو مذہب کی طرف سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا ہے اُسوقت سے تمام دوسرے مذاہب کے سربرآوردہ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر امبدکر اور ہریجن جماعت کو اپنے مذہب کے دائرہ میں لے آئیں۔

چونکہ ڈاکٹر امبدکر کا ہندو مذہب کو ترک کرنا احتجاج ہے اس عدم مساوات کے خلاف جو ہندو سوسائٹی میں پائی جاتی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر امبدکر اسی مذہب کو اختیار کریں گے جو زیادہ سے زیادہ حقوقِ مساوات دیکے اور اسی بنا پر جو دعوت نامے ڈاکٹر صاحب موصوف کے نام دیگر مذاہب کی طرف سے بھیجے گئے ہیں ان میں اس بات کا وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ پوری مساوات دینے کے لئے طیار ہیں، اور مسلمانوں کی طرف سے بھی اسی نوع کا تبلیغی لٹریچر ان کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

الغرض ڈاکٹر امبدکر نے اس وقت ہندوستان کے مذہبی کھیل میں ایک جام زریں (گولڈ کپ) کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس مسابقت میں یہ نشانِ فتح و کامرانی کس کو ملنے والا ہے۔

اس مسئلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اُصولاً مذہب اور اجتماعی معاشرت کا قانون دونوں ایک ہی

چیز ہیں یا مختلف اور اگر دونوں ایک ہی چیز ہیں تو ہمارا عمل اس کا موید ہے یا نہیں۔

اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندو مذہب، مذہب ہونے کی حیثیت سے کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا، بلکہ وہ ایک نظامِ معاشرت ہے، سوسائٹی کے قواعد کا ایک جال ہے جس میں ہر طبقہ کا ہندو جکڑا ہوا ہے اور اس سے چھٹکارا اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک کسی اور سوسائٹی میں اس کو پوری جگہ نہ مل جائے۔ اسلئے ڈاکٹر امبدکر کا یہ خیال کہ وہ ہندو سوسائٹی میں شامل رہنے کے بعد مساوات کبھی حاصل نہیں کر سکتے، بالکل صحیح و درست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہریجن جماعت کوئی اور مذہب اختیار کرنے کے بعد عملاً اس بلا سے نجات حاصل کر سکتی ہے یا نہیں۔ اور غالباً اسی فیصلہ کا انھیں بھی انتظار ہے۔

جس وقت میں اسلام کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے علما کا ڈاکٹر امبدکر اور ہریجن جماعت کو یہ کہکر مسلمان بنانے کی کوشش کرنا کہ وہ حقیقی مساوات دینے کے لئے طیار ہیں کس حد تک درست ہے۔ اس سے غالباً انکار ممکن نہیں کہ اسلام اور اسلام کیا دنیا کا ہر مذہب چند مخصوص عقاید کا مجموعہ ہوا کرتا ہے اور چونکہ عقاید کا تعلق صرف وجدانی اعتراف و یقین سے ہے، اس لئے کوئی شخص یا کوئی گروہ اسوقت تک اُصولاً کسی مذہب میں شامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کے مخصوص عقاید کا اعتراف زبان سے اور انکی تصدیق قلب سے نہ کرے۔ یعنی اگر میں صرف زبان سے خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اظہار کروں اور دل میں میرے تذبذب ہو تو میں کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھکر غور کیجئے کہ مسئلہ زیر بحث کی صورت کیا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں ہندو مذہب سے صرف اس لئے بیزار ہوں کہ مجھے اس کے ماننے والے حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں، آپ کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمھیں ذلیل نہیں سمجھیں گے تمھیں پورے حقوق مساوات دیں گے اور وہ آپ کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے، تو کیا وہ شخص حقیقتاً مسلمان ہو گیا، اور کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ اس کا اس طرح مسلمان ہو جانا اِس کو بھی متلزم ہے کہ اس نے آپ کے رسول کے نبی آخر الزمان ہونے کو بھی تسلیم کر لیا، آپ کے "ملائکتہ و کتبہ" کو بھی مان لیا، آپ کے یوم آخرت پر بھی ایمان لے آیا، اور "بعث بعد الموت" کا بھی قایل ہو گیا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو مذہب کے صحیح نقطۂ نظر سے ہم ایسے شخص کو کیونکر مسلمان باور کر سکتے ہیں۔

اگر اس وقت ڈاکٹر امبدکر یا پوری ہریجن جماعت مسلمان ہو بھی جائے (جس کی مجھے کوئی توقع نہیں ہے) تو ظاہر ہے کہ اس کا اسلام لانا صرف معاشرتی و سیاسی مصالح کی بنا پر ہوگا نہ کہ مذہبی نقطۂ نظر سے، یعنی وہ اپنے معاشرتی حقوق تو مسلمانوں سے برابر کے حاصل کر لیں گے لیکن اُن کے دل و دماغ میں وہی مندر اور اس کے وہی بُت بسے ہوں گے جن کی پوجا کی انھیں اجازت نہ دیجاتی تھی، پھر یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہریجن جماعت کے

اسلام لانے کے بعد مردم شماری کے تختہ میں مسلمانوں کی اقلیت کچھ کم ہو جائے، لیکن شاید لوحِ محفوظ میں اُن کا نام کہیں نظر نہ آئے گا۔

اول تو مذہب جن عقاید سے تشکیل پاتا ہے ان کا تعلق زیادہ تر قومی روایات سے ہوا کرتا ہے جو گہوارہ ہی سے انسان کے دل و دماغ میں مرتسم کئے جاتے ہیں اور جن کا محو ہونا تقریباً محال ہے، لیکن اگر مذہب میں عقل و فراست کا درخور ہو بھی تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے نہایت وسیع مطالعہ، حد درجہ عمیق فکر و غور کی ضرورت ہے جس کی توفیق اسوقت تک ہریجن جماعت کیا شاید خود ڈاکٹر امبدکر کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔ اس لئے اگر اس وقت ڈاکٹر امبدکر (مع اپنے اُن چند مقلدین کے جو حقیقتاً خود اپنے مذہب سے بھی واقف نہیں ہیں چہ جائیکہ عقاید اسلام) مسلمان ہو بھی گئے تو میرے نزدیک، وہ کبھی صحیح معنے میں مسلمان نہ ہو سکیں گے اور مسلمانوں کا اُن کو یہ کہکر مسلمان بنانا کہ ہم تمکو حقوق مساوات دینے کے لئے طیار ہیں، کبھی دیانت کی صحیح مثال میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے علماء اور مبلغین بخوبی واقف ہیں کہ ہریجن جماعت، کا اس وقت مسلمان ہونا — (اگر وہ مسلمان ہوئے) صرف اس طمع سے ہوگا کہ ممکن ہے ان کی معاشرتی سطح بلند ہو جائے اور اُن کے سامنے یہ کوئی سوال نہیں ہے کہ مسلمانو کے عقاید کیا ہیں اور وہ کس حد تک ان کے لئے قابل قبول ہیں۔ اس لئے کیا میں مسلمانوں سے دریافت کر سکتا ہوں کہ کوئی ایسی جماعت جو اُن کے " ایمان مجمل و مفصل " سے ناواقف رہنا چاہتی ہے، جو اُن کی مذہبی روایات کے متعلق کوئی جذبہ احترام اپنے دل میں نہیں رکھتی جو اُن کے اُصول مذہب کی خوبی کی صحیح معنی میں قایل نہیں ہے جو اُن کے معاد و حشر و نشر کے عقاید کو مطلق نہیں سمجھتی، کیا وہ صرف اس لئے مسلمان سمجھی جا سکتی ہے کہ اس نے کسی سوسائٹی کے خلاف احتجاج کرنے یا اس سے انتقام لینے کے لئے مذہب اسلام میں شامل ہونے کا اعلان صرف زبان سے کر دیا ہے۔

اگر ایک مسلمان ہونے کے لئے صرف یہی شرط درکار ہے، اگر مذہب اسلام ایسے شخص کو مسلمان سمجھ سکتا ہے جو زبان سے کعبہ کا اعتراف کرے اور دل میں بُت ہی بُت بھرے ہوں، تو مجھے حیرت ہے کہ خود اُن مسلم افراد کو کافر و ملحد کہکر اپنی برادری سے نکالنے کے کیا معنی ہیں جو کعبہ کا احترام تو ویسا ہی کرتے ہیں جیسے تمام مسلمان، لیکن وہ اس کو مسنگدہ کی حیثیت سے پوجنے کے لئے طیار نہیں۔

الغرض ہریجنوں کا مسلمان ہونا یا اُن کو اسلام کی دعوت دینا صرف یہ کہکر کہ مسلمان اُن کو اپنی برادری میں شامل کر کے برابر کے حقوق دینے کے لئے آمادہ ہیں، خالص مذہبی نقطہ نظر سے کوئی معنی نہیں رکھتا اور اگر ڈاکٹر امبدکر کا یہ اعلان کہ وہ ہندو مذہب ترک کرنے والے ہیں حقیقتاً کوئی چال نہیں ہے تو مسلمانوں کا اُن کو اسلام کی دعوت دینا یقیناً صرف سیاسی چال ہے اور میں کبھی اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ ہریجن جماعت "تصدیق بالجنان"

کے لحاظ سے اب یا کسی وقت مسلمان کہلائی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر مسلمانوں کا ایمان مفصل و مجمل صرف یہ ہوتا کہ تمام انسان برابر ہیں، جملہ افرادِ نوعِ انسانی ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اس عقیدہ میں کسی اور خیال کا دخل نہ ہوتا تو بیشک مسلمانوں کی طرف سے دعوتِ اسلام صحیح ہوسکتی تھی اور ہریجن جماعت اسلام لانے والی بھی کہلائی جاسکتی تھی، لیکن چونکہ مذہباً اسلام کا مفہوم یہ نہیں ہے اس لئے یہ دعوت ہی سرے سے غلط ہے اور اسکے ردو قبول پر غور کرنا اس سے زیادہ غلط۔

یہاں تک مذہبی نقطۂ نظر سے گفتگو ہوئی۔ اب سماجی حیثیت سے اس مسئلہ پر غور کیجئے تو اس کی لغویت اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کا ہریجن جماعت سے یہ وعدہ کرنا کہ وہ اُن کو حقوق مساوات دینے کیلئے طیار ہیں، صرف مقالاً تو درست ہوسکتا ہے لیکن عملاً اس کی کوئی امید نہیں۔

یہ بالکل درست ہے کہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے کہ نسل و رنگ کا امتیاز مٹ جائے، سوسائٹی کا غلط فرقِ مراتب محو ہوجائے لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اسوقت جو تیرہ صد سال سے مسلمان چلی آرہی ہیں اُن میں کب مساوات کے اُصول پر عمل کیا جاتا ہے کہ آئندہ ہریجنوں کو کوئی تازہ توقع پیدا ہوسکے۔

اس وقت مسلمانوں کا طبقہ بھی سوسائٹی کے لحاظ سے اتنا ہی قابل اعتراض ہے جتنا ہندوؤں کا۔ جس طرح اونچی ذات کے ہندو نیچی ذات کے ہندوؤں سے علحدہ رہنا چاہتے ہیں بالکل اسی طرح اونچے درجے کے مسلمان بھی پسند نہیں کرتے کہ وہ معمولی درجہ کے مسلمانوں سے معاشرتی تعلقات قایم کریں۔ ہندوؤں میں اگر ایک جماعت اُن بدنصیب افراد کی پائی جاتی ہے جو کوری، چمار وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں تو مسلمانوں میں بھی دھنئے، جلاہے اور مہتر وغیرہ اس لحاظ سے خوش نصیب نہیں کہلائے جاسکتے۔ مساوات کی پہچان صرف یہ نہیں ہے کہ ہم سب ملکر ساتھ کھانا کھائیں، یا "بھائی بھائی" کہکر عید کے دن ایک دوسرے سے گلے مل لیں، بلکہ اس کا تعلق صرف احساس سے ہے اور اس کی سب سے بہتر کسوٹی رشتۂ ازدواج ہے۔ پھر مسلمانوں کی جماعت میں وہ کون سب سے بڑا مسلمان ہے جو اس معیار پر پورا اُتر سکتا ہے اور وہ کونسا مدعی مساوات "مولانا" ایسا ہے جو اپنی لڑکیوں کو مسلمان مہتروں یا نو مسلم ہریجنوں کے ساتھ بیاہ دینے کے لئے آمادہ ہوسکتا ہے۔ جو قوم ابھی تک نکاح کے باب میں شیخ و سید، فاروقی و صدیقی کا امتیاز نہ اُٹھا سکی ہو وہ کیا مساوات کا دعویٰ کرسکتی ہے اور وہ غریب نو مسلم ہریجنوں کو کیا برابر کے حقوق دے سکتی ہے۔

میں نے ابتدائی سطور میں ظاہر کیا تھا کہ اُصولاً سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ مذہب اور سوسائٹی دونوں ایک ہی چیز ہیں یا مختلف اور غالباً اب اتنی بحث کے بعد یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ مذہب سوسائٹی سے بالکل علحدہ چیز ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کسی قوم کا مذہب اختیار کرنے کے بعد اس کی سوسائٹی میں بھی

شامل کرلیا جائے۔ مساوات کا دعوےٰ کرنے والے مذاہب میں اسلام و عیسویت کو خاص امتیاز حاصل ہے لیکن ان کی سوسائٹی کے قانون میں وہی عدم مساوات پائی جاتی ہے جو دیگر مذاہب میں۔

جس طرح ایک نومسلم مہتر مسلمانوں کی معاشرت میں بدستور مہتر ہی بنا رہتا ہے، اسی طرح عیسائیوں میں ایک نوعیسائی چمار، چمار ہی رہتا ہے، نہ وہ مسلمان امراء کی مجلسوں میں شریک ہوسکتا ہے اور نہ یوروپین ڈنروں میں، نہ اُسے کوئی شیخ سید اپنی لڑکی دیسکتا ہے، نہ اس کے ساتھ کوئی ڈپٹی کمشنر اپنی مس گرجا میں بھیج سکتا ہے۔ جس حد تک خدا کی وحدانیت اور عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کا تعلق ہے ایک مسلمان مہتر، ایک عیسائی چمار یقیناً شمس العلماء مولانا رحمت اللہ اور لارڈ آکلینڈ کے برابر ہے، لیکن تمدن و معاشرت میں وہ کبھی یکساں نہیں سمجھے جاسکتے یعنی آخرت میں جب سوال نعائم بہشت کی تقسیم کا ہوگا تو ممکن ہے دونوں کو برابر کا حصہ مل جائے، لیکن اس دنیائے جہنم زار میں ان دونوں کی سطح بالکل مختلف ہوگی۔ اس لئے اگر ڈاکٹر امبدکر صرف اس لئے مسلمان ہونا چاہتے ہیں کہ انھیں اسلام کے حور و قصور سے زیادہ رغبت ہے یا بہشت کا تصور اُن کے لئے زیادہ فرحت بخش ہے تو اہلاً و سہلاً شوق سے تشریف لائیں اور مسلمان ہوکر کوثر و سلسبیل میں برابر کے حصہ دار ہوجائیں لیکن اگر وہ اس بات کے آرزومند ہیں کہ مسلمان اس دنیا میں ہریجنوں کو اپنے برابر سمجھنے لگیں تو مجھے افسوس ہے کہ ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوسکتی —— "وعدۂ فردا" ضرور اُن کے لئے حاضر ہے لیکن آج کوئی نقد سودا اُن سے نہیں کیا جاسکتا۔

اب اس سلسلہ میں بحث کے دو پہلو اور رہجاتے ہیں ایک یہ کہ مسلمانوں کے لئے ہریجنوں کا اسلام لے آنا واقعی کوئی مفید بات ہے یا نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر ڈاکٹر امبدکر واقعی ہندو مذہب ترک کرنا چاہتے ہیں (درانحالیکہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ صرف سوسائٹی کا نظام ہے) تو پھر انھیں کونسا مذہب اختیار کرنا چاہئے۔

امر اول کے متعلق بھی میری رائے وہ نہیں ہے جو عام طور پر ظاہر کی جاتی ہے یعنی مسلمانوں کا یہ خیال کہ وہ ہریجنوں کو اپنی جماعت میں شامل کرکے اپنی سیاسی اہمیت کو قائم کرسکیں گے میرے نزدیک بالکل نادرست ہے۔ میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کرچکا ہوں اور پھر اسی کی تکرار کرتا ہوں کہ نظام تمدن و سیاست میں تعداد کا سوال کبھی اہم نہیں سمجھا گیا بلکہ ہمیشہ صلاحیت و اہلیت کو دیکھا جاتا ہے۔ بھیڑوں کے گلہ کو خواہ وہ دس کا ہو یا بیس کا ایک ہی آدمی ہانک کر جہاں چاہے لیجاسکتا ہے اور صرف ایک شیر کو قابو میں لانے کے لئے درجنوں آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی جماعت میں صرف سو آدمی ہیں لیکن ہیں سب کے سب ذی فہم و ذی شعور تو وہ یقیناً اس جماعت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جس میں ہزار افراد شامل ہیں لیکن ہیں سب ناتراشیدہ۔ تاریخ اُٹھاکر دیکھئے آپ کو اس نظریہ کی صداقت ہمیشہ اور ہر جگہ نظر آئے گی۔ خود تاریخ اسلام میں متعدد واقعات ایسے ملیں گے کہ چند نفوس نے بڑی بڑی جماعتوں پر غلبہ حاصل کرلیا۔ اسلئے مسلمانو کا یہ خیال کہ وہ جاہل و غیر مہذب ہریجنوں کو اپنے اندر شامل کرکے کوئی خاص قوت حاصل کرسکیں گے اصولاً و تاریخاً دونوں

طرح بالکل غلط ہے۔ ضرورت تو حقیقتاً یہ ہے کہ اپنے ناکارہ افراد کو بھی اپنے سے علحدہ کر دیا جائے نہ یہ کہ ان میں اور اضافہ کیا جائے۔ آج مسلمانوں کے ادبار و انحطاط کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے موجودہ افراد میں سے اکثر جاہل و غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے قوم کی گردن پر ایک ناگوار بار بنے ہوئے ہیں چہ جائیکہ ہریجنوں کو اپنے میں شامل کر کے اس بار کو اور زیادہ ناقابل برداشت بنا لیا جائے۔ حیرت ہے کہ ضرورت تو بوجھ ہلکا کرنے کی ہے اور ہم اس کو اور بڑھانے کی فکر میں ہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ڈاکٹر امبدکر اور ہریجن کونسا مذہب اختیار کریں، سو اس کے متعلق میں ان کو مشورہ دوں گا کہ اگر سوشل اصلاح کے لئے وہ کسی مذہب کا اختیار کرنا ضروری سمجھتے ہیں (درانحالیکہ یہ بالکل غیر ضروری ہے) تو اُن کو بدستور ہندو ہی رہنا چاہئے کیونکہ ممکن ہے ان کا موجودہ اضطراب کسی وقت ہندو سوسائٹی میں کوئی مفید تغیر پیدا کر سکے، لیکن اگر وہ اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں اور ترک تعلق کا فیصلہ ہی کر چکے ہیں تو مناسب یہ ہو گا کہ وہ کوئی مذہب نہ اختیار کریں بلکہ اپنا مسلک صرف لامذہبیت قرار دیں جس کا آغاز و انجام سوائے "انسانیت" کی پرستش کے اور کچھ نہ ہو۔

اگر خدا کے وجود کا عقیدہ ان کے دل سے نہیں نکل سکتا (اور نکلنا بھی نہیں چاہئے) تو خدا کو پابند سمجھنے کے بجائے آزاد مطلق سمجھیں اور ایک ایسی ہستی سمجھ کر اس سے رشتہ قائم کریں جو مسجد میں بھی ہے اور مندر میں بھی، کلیسا میں بھی ہے اور آتشکدہ میں بھی، اور جو برہمن و شودر کے امتیاز سے بہت بلند ہے۔ ان کا مذہب تمام مذاہب کے اصول کو صحیح و صادق سمجھ کر سب کا احترام کرنا ہو اور خود کسی کا پابند نہ ہونا۔ اپنی سوسائٹی سب سے علحدہ بنائیں، ایک مستقل جداگانہ اہمیت اس میں پیدا کریں جس کا بہترین طریقہ تعلیم کا رواج ہے۔ ہندوؤں کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنا کبھی اتنا سود مند نہیں ہو سکتا جتنا ہریجنوں کے اندر صحیح تعلیم کی اشاعت کرنا جو انسان کو خود اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھاتی ہے اور جو بجائے کعبہ و مندر کے اس خدا کی پرستش کا درس دیتی ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے۔ عزم و ولولہ کی صورت میں صداقت و انسانیت کی صورت میں اور اس "انانیت" کی شکل میں جو خدا کو انسان تو نہیں لیکن انسان کو خدا ضرور بنا سکتی ہے۔

معذرت

میں نے پچھلے مہینے کے نگار میں دو وعدے کئے تھے ایک یہ کہ مسئلہ خلافت و امامت پر اس ماہ کی اشاعت میں اپنا محاکمہ پیش کر دوں گا اور دوسرے یہ کہ جناب منذر وزئی صاحب مہدوی کے مضمون کو شائع کر کے اس کا جواب دوں گا، لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی وعدہ پورا نہ کر سکا۔

اس کا سبب یہ ہوا کہ ٹھیک اس وقت جب یہ مضامین کاتب کے سپرد کرنا چاہئے تھا، مجھے معلوم ہوا کہ ایک خاص ضرورت سے مجھے بہت جلد حیدر آباد جانا ہوگا اور میں تمام کام چھوڑ کر اُن کاغذات کی طیاری میں مصروف ہو گیا جنکی تکمیل پر میرا حیدر آباد جانا منحصر تھا۔ نگار کی کتابت تو بہر حال رُک نہ سکتی تھی، اس لئے دسمبر کا پرچہ میرے ان دونوں مضمونوں سے خالی رہا۔ ہر چند مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے کیوں دوسرے کام کی طرف توجہ کی، جبکہ ہنوز نہ میں حیدر آباد جاسکا ہوں اور نہ آیندہ یقین کے ساتھ اپنے جانے یا نہ جانے کے متعلق کچھ کہہ سکتا ہوں ۔ بہر حال اس کوتاہی کہئے یا مجبوری میں معذرت خواہ ہوں اور اُن تمام احباب کو جو ان دونوں مضامین کے منتظر ہیں، یقین دلاتا ہوں کہ فروری کے نگار میں حتماً دونوں مضامین شایع ہوں گے اور بالکل ممکن ہے کہ اس فرصت و مہلت میں زیادہ تکمیل و اہتمام کے ساتھ میں انھیں طیار کرسکوں ۔ جنوری کا نگار چونکہ ہندی شاعری کیلئے وقف ہے اسلئے اس میں کسی اور موضوع پر بحث کا موقعہ ہی نہیں ۔

جنوری ۱۹۳۶ء کا رسالہ

تقریباً مرتب ہو چکا ہے اور کتابت شروع ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔

جو حضرات جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار ملاحظہ فرما چکے ہیں ان کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار کیا چیز ہوگا۔

اس میں سب سے پہلا مضمون تین جزو کا "ہندی شاعری کی تاریخ" پر ہے اور اس کے بعد متعدد انتقادی مضامین مختلف مباحث پر درج کئے گئے ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ ہندی کی عاشقانہ شاعری اس کی لطیف و شیریں تشبیہات، اس کی جذبات نگاری اور پاکیزہ طرز بیان اتنی مشہور چیز ہے کہ ہر شخص اس کا معترف ہے ۔ اس لئے پوری کوشش کی گئی ہے کہ اس نوع کا بہترین انتخاب ناظرین نگار کی خدمت میں پیش کیا جائے ابھی تک اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا ہے، لیکن دو سو صفحات تک اس کا پہونچ جانا یقینی ہے، ممکن ہے اس سے بھی زیادہ بڑھ جائے ۔

ڈراما اصحاب کہف ابھی تک جناب نیاز کی مصروفیت کی وجہ سے ختم نہیں ہو سکا، لیکن امید ہے کہ فروری میں شایع ہو جائے گا اور جن حضرات کا نام ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء کو رجسٹر خریداران میں درج پایا جائیگا ان کی خدمت میں بشرط طلب معہ محصول ۱۲ میں روانہ کر دیا جائیگا ۔ افسوس ہے کہ غیر خریداران نگار اسکو کسی قیمت میں بھی حاصل نہیں کر سکتے یہ ڈراما اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہوگا اور اس قدر بلند و نازک جذبات محبت کا حامل ہوگا کہ مشکل سے آپکو کوئی دوسری نظیر اسکی مل سکے گی۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم بھی زیادہ سے زیادہ فروری میں شائع ہو جائے گا اور اسکی قیمت بھی معہ محصول خریداران نگار کے لئے ۴؎ ہوگی۔ غیر خریداران نگار سے ایک روپیہ زاید لیا جائے گا ۔ منیجر نگار - لکھنؤ

حریت فکر اور اشاعت علم کے خلاف مذہب کی جنگ

ہیکل منروا سے متصل خانقاہ سنتا میریا کے درمیانی کمرہ میں ایک لانبی میز بچھی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف مفتیان مذہب علیسویت کی جماعت حلقہ کئے ہوئے بیٹھی ہے۔ سامنے ستر سال کا ایک ضعیف انسان جس کے بال برف کے گالے کی طرح سفید ہیں سر جھکائے ہوئے دوزانو نظر آتا ہے۔ کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ دفعتاً مفتی اعظم کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک کاغذ کھولکر بلند آواز سے اس فیصلہ کو سُناتا ہے جو مذہب کی طرف سے اس ضعیف گنہگار کے خلاف صادر ہوا ہے۔

ایک دوسرا کاغذ مجرم کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ بلند آواز سے پڑھکر سب کو سُنائے، چنانچہ وہ اسے پڑھتا ہے اور انجیل مقدس پر ہاتھ رکھ کر اس کاغذ پر دستخط کرتا ہے اور خانقاہ سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

یہ تھا مقدس منظر اُس مقدس فیصلہ کا جو معمر گلیلو کے خلاف سنایا گیا اور صرف اس معصیت پر کہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا ہیئت داں تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔

فروری ۱۵۶۴ء کی ۱۸ تاریخ تھی کہ گلیلو بمقام پیسا (Pisa) پیدا ہوا یعنی ٹھیک اس تاریخ میں جب میکائیل اینجلو کا انتقال ہوا اور جس کے چند ہفتے بعد شیکسپیر عالم وجود میں آیا۔ اسی سال جان کالون کا بھی انتقال ہوا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گلیلو کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی جب دنیا کچھ بہتر ہو چلی تھی۔

اس کا باپ (ونسنزو گلیلی) فلارنس کے ایک شریف گھرانے کا آدمی تھا اور اس کی ماں (جولیا) بھی ایک قدیم معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

گلیلو ابھی بہت چھوٹا تھا کہ اس کے والدین فلارنس چلے آئے جہاں ان کی مستقل سکونت تھی۔ اسکا باپ خاصہ پڑھا لکھا آدمی تھا اور اس نے موسیقی پر ریاضی کے نقطۂ نظر سے کچھ جدید نظریے پیش کر کے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ گلیلو کی ابتدائی تعلیم اول اول ایک پرائیوٹ ٹیوٹر کے ذریعہ سے ہوئی اور اس کے بعد خانقاہ ولمبروسا بھیجدیا گیا۔ یوں تو اُسے ادب قدیم کے مطالعہ کا بھی شوق تھا، نظم سے بھی لگاؤ تھا، لیکن سب سے زیادہ رجحان علوم عقلیہ کی طرف تھا۔ اسی لئے اس کے باپ نے کلیۂ پیسا میں فن طب کی تعلیم کے لئے اسے بھیجدیا (۱۵۸۱ء)

یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی یونیورسٹیوں میں صداقت کا معیار صرف ارسطو کے نظریوں کو سمجھا جاتا اور یونان قدیم کے اس مفکر کے خلاف کچھ کہنا گویا خدا کی خدائی سے انکار کرنا تھا۔ لیکن گلیلو ان معمولی لوگوں میں سے نہیں تھا جو ارسطو کے اقوال پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لے آتا۔ وہ ان پر غور کرتا تھا اور بہت سی باتوں میں اُس کا مخالف تھا۔

اس کی غیر معمولی ذہانت اور اخذ نتائج کی قوت کا ایک واقعہ اس جگہ بیان کرنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ایک دن اپنے عنفوان شباب کے زمانہ میں گلیلو کسی گرجا میں پہونچا اور اس کی نگاہ ایک فانوس پر پڑی جو محراب میں لٹکا ہوا تھا۔ ملازم کلیسا نے اس فانوس کو ایک طرف ہٹا کر روشن کیا اور چھوڑ دیا۔ فانوس اِدھر اُدھر جھولنے لگا۔ یہ منظر گلیلو سے قبل ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے سامنے آیا ہوگا، لیکن اس نے جس نگاہ سے دیکھا وہ کچھ اور تھی۔ اس نے غور کیا کہ فانوس کے اہتزاز میں رفتہ رفتہ کمی پیدا ہوئی یہاں تک کہ وہ عمودی خط میں پھر اپنی اصلی جگہ آگیا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس کے تمام اہتزازات میں وقت ایک ہی صرف ہوا، یعنی اگر پہلا لمبا اہتزاز ایک سکنڈ میں ہوا تھا تو دوسرا اس سے کم لمبا بھی ایک ہی سکنڈ میں ختم ہوا یہاں تک کہ اس کی آخری جنبش بھی جس نے بہت ہی کم جگہ لی تھی اتنے ہی وقفہ میں پوری ہوئی۔ اس کا یہ اکتشاف Isochronism (تساوی الزمن) کہلاتا ہے اور سب سے پہلے اسی نے کلاک میں وقت کی پیمائش کے لئے اس اُصول کو استعمال کیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں اس کی ملاقات ایک مشہور ریاضی داں ونسنزو (Vincenzo) سے ہوگئی اور اس نے باوجود اپنے باپ کی مخالفت کے ریاضیات اور طبیعیات کا مطالعہ شروع کردیا، لیکن چونکہ اقتصادی حالت عرصہ تک یونیورسٹی کی تعلیم جاری رکھنے کی موافق نہ تھی اور لوگوں کی مخالفت کے خیال سے ٹسکنی کے ڈیوک نے بھی کوئی مدد اس کی نہیں کی اس لئے اُسے یونیورسٹی کی تعلیم ترک کرنا پڑی۔

اب اس نے گھر بیٹھ کر اپنا مطالعہ وسیع کرنا شروع کیا اور علمی تجربات و تحقیقات میں پورے انہماک کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے آرشمیدس کا بھی مطالعہ کیا جسے یورپ عرصہ سے فراموش کرچکا تھا اور اسی سلسلہ میں اپنے "توازن مایعات" (Hyrostatic balance) کا اکتشاف کیا جس کی مدد سے جواہر کا ثقل نوعی نہایت صحت کے ساتھ دریافت ہوسکتا تھا۔

اس دوران میں گلیلو کی رقاص والی گھڑیاں کثرت سے بننے لگی تھیں اور بجائے دھوپ گھڑی کے ان کا رواج تمام یورپ میں ہوگیا تھا۔ از روئے اس قدر مشہور ہوگیا کہ پیسا یونیورسٹی نے اس کو ریاضی کا پروفیسر بنانا منظور کرلیا۔ اس وقت اُس کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔

اب اسے زیادہ اطمینان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا اور اسی زمانہ میں اس نے وہ زبردست انقلاب انگیز انکشاف کیا جسے "کشش ثقل" کہتے ہیں اور جس کا نام ہی "قانون گلیلو" پڑگیا۔ اس سے قبل ارسطو نے جو نظریہ "کشش ثقل" کا قائم کیا وہ یہ تھا کہ کسی ٹھوس چیز کی رفتار جب وہ زمین کی طرف مایل ہو منحصر ہے اس چیز کے وزن پر۔ یعنی ایک چیز جس قدر زیادہ وزنی ہوگی اتنی ہی سرعت کے ساتھ زمین کی طرف جائے گی۔۔۔ دو ہزار سال سے اسی نظریہ پر سب کا ایمان تھا اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ اس کے خلاف کوئی لفظ منھ سے نکال سکے۔ لیکن گلیلو نے منارۂ پیسا پر چڑھکر خود اس کا عملی تجربہ کیا اور آخر کار اس نے ارسطو کے اس نظریہ کی تردید کر کے اعلان کیا کہ جو اجسام ہلکے ہوں یا بھاری سب کو زمین تک پہونچنے میں ایک ہی وقت درکار ہوتا ہے اور اس طرح ایک اور اہم قانون فطرت کا انکشاف اس نے کیا۔

اس پر لوگوں میں بہت برہمی پیدا ہوئی اور ارسطو کے طرفداروں نے اسے یونیورسٹی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد وہ مارکوئس ڈل مانٹی کی مدد سے جو گلیلو کا بہت معرف تھا پڈوا یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر ہوگیا یہ واقعہ ۱۵۹۲ء کا ہے۔

یہاں پہونچکر وہ اپنے تجربات میں زیادہ انہاک کے ساتھ مصروف ہوگیا اور ۱۵۹۹ء میں ایک ہوشیار میکانک کی خدمات حاصل کر کے عملی طور پر اپنے تمام نظریوں کا امتحان کرنے لگا، گلیلو کے اختراعات و انکشافات بہت ہیں، اور انھیں میں سے ایک تھرمامیٹر ہے جسے ۱۶۰۲ء میں اس نے ایجاد کیا[1]۔

لیکن اس کی اہم ترین ایجاد جس نے فلکیات کے قدیم نظریوں کو درہم برہم کر کے رکھدیا اور جو اس کے تکالیف و مصائب کا باعث بھی ہوئی، "دوربین" تھی۔ ۱۶۰۹ء میں جب شیکسپیر ڈرامے لکھنے میں مصروف تھا، گلیلو دوربین کے شیشوں کو اپنے ہاتھ سے گھس گھس کر چکنا بنا رہا تھا۔ ہر چند دوربین کا خیال اس سے قبل ڈچ کا ایک عینک ساز پیش کر چکا تھا، لیکن گلیلو نے اس سے بالکل علحدہ خود اپنی قوت فکر سے کام لے کر اس کام کو شروع کیا۔ گلیلو نے اسی زمانہ میں اپنے برادر نسبتی لان ڈوسی کو ایک خط لکھا جس کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

> "دو مہینے ہوئے جب یہاں ایک خبر اُڑی کہ فلانڈرس کے کسی آدمی نے ایک ایسا آلہ طیار کیا ہے جس سے دو میل کی چیز بھی صاف نظر آتی ہے۔ میں یہ سنکر بہت متعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ ایسا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ آخر کار میں اس میں کامیاب ہوگیا اور ایسی قوی دوربین

---

[1] اول اول درجۂ حرارت کی پیمایش میں پانی سے مدد لیگئی، بعد کو اسپرٹ سے اور پھر اس کے بہت زمانہ بعد پارہ سے کام لیا گیا۔

طیار کرلی کہ وینس۔ کے تمام اکابر و امرار دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیونکہ اس سے پچاس میل کا فاصلہ صرف پانچ میل رہجاتا ہے"۔

دوربین طیار کرنے کے بعد گلیلو نے سب سے پہلے آسمان اور اس کے ستاروں کا مشاہدہ اس کے ذریعہ سے کیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہگیا کہ جتنے ستارے عُریاں آنکھ سے نظر آتے ہیں اُن سے کہیں زیادہ دوربین سے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ایجاد نے ہیئت کے نظام بطلیموسی کو سخت صدمہ پہونچایا جس کا یورپ معتقد تھا اور جو بتاتا تھا کہ ستارے کسی ایسی ٹھوس دیوار میں جڑے ہوئے ہیں جو زمین کے چاروں طرف قایم ہے۔ کیونکہ گلیلو نے اپنی دوربین کے ذریعہ اس امر کو ثابت کیا کہ ستارے زمین سے مختلف دوریوں پر واقع ہیں اور اس لئے ان کا ایک ہی سطح پر جڑا ہوا سمجھنا درست نہیں۔ اسی سلسلہ میں اس نے کہکشاں کا مطالعہ بھی دوربین سے کیا اور لوگوں کو بتایا کہ یہ روشن سڑک مجموعہ ہے بیشمار ستاروں کا جو فضا میں مختلف دُوریوں پر پائے جاتے ہیں۔

اس نے یہ بھی دریافت کیا کہ کرہ مشتری کے چار چاند ہیں[1]، اس نے یہ بھی بتایا کہ زحل کے چاروں طرف ایک منور حلقہ پایا جاتا ہے اور چاند کے جغرافیہ پر بھی کچھ روشنی ڈالی۔ یہ باتیں ایسی تھیں کہ دنیا سنکر حیران رہگئی اور دوربینوں کی مانگ اسقدر بڑھ گئی کہ اس کا پورا کرنا مشکل ہوگیا۔

اب گلیلو کی شہرت اتنی وسیع ہو گئی کہ ٹسکنی کے گرانڈ ڈیوک نے اسے فلارنس واپس بلالیا اور یہاں اس نے اطمینان سے سیاروں کی گردش کا مطالعہ کرکے نظام کوپرنیکس کا اعلان کیا جو زمین کی گردش کا حامی تھا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت جب اس کے علمی انکشافات دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہے تھے، فلارنس اور روم کی قدامت پرست مذہبی جماعتیں اس سے بیزار تھیں اور سمجھتی تھیں کہ گلیلو مذہب کا دشمن ہے اور صحف مقدسہ کے بتائے ہوئے اُصول ہیئت کے خلاف اس کے انکشافات دنیا میں بیدینی پھیلانے والے ہیں چنانچہ فلارنس ہی میں ایک جلسہ اس کے خلاف منعقد ہوا اور اس میں ایک مذہبی واعظ نے لوگوں کو سمجھایا کہ زمین کی حرکت کا قایل ہونا انجیل کی مخالفت ہے اور اس لئے تمام ایسے لوگوں کو جو علم کے نام سے مذہب و تعلیمات مذہب کی مخالفت کرتے ہیں سخت سزا دینا چاہئے۔

گلیلو نے یہ حالات معلوم کرکے پادری کاسٹلی کو ایک دوستانہ خط لکھا کہ "حرکت زمین کی تردید کسی جگہ انجیل میں نہیں پائی جاتی اور اسی کے ساتھ یہ بھی التجا کی کہ خدا کے لئے علمی تحقیقات میں رخنہ اندازی نہ کیجئے"۔ اتفاق سے یہ خط راہب فادر لوریٹی کے ہاتھ پڑ گیا اور اس نے اس کی ایک نقل روم کی مذہبی عدالت

---

[1] اب زیادہ قوی دوربینوں کی مدد سے ان اقمار کی تعداد بجائے چار کے نو معلوم ہوئی ہے۔

کو بھیجدی جہاں فوراً اس کے خلاف کارروائیاں شروع کردی گئیں۔

گلیلو کے دوستوں نے اسے سمجھایا کہ خاموش رہو اور کوئی جوابدہی ان الزامات کی نہ کرو، لیکن چونکہ وہ اپنے آپ کو بیگناہ سمجھتا تھا اس لئے وہ روم چلا گیا اور وہاں اپنا پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُدھر یہ کارروائی ہوئی کہ گلیلو کے خط کی نقلیں مذہبی عدالت کے تمام ججوں کے پاس روانہ کرکے ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ شخص جو آفتاب کو دنیا کا مرکز بتاتا ہے اور جو زمین کی گردش کا قایل ہے اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے۔ سب نے بالاتفاق یہی کہا کہ ایسا شخص مذہب کا دشمن ہے اور اس کو وہی سزا دینا چاہئے جو ایک عدوئے دین و ایمان کے لئے مقرر ہے۔

آخرکار ۲۵ فروری (۱۶۱۶ء) کو عدالت گاہ میں گلیلو کو طلب کیا گیا اور حکم سُنا دیا گیا کہ اگر وہ اپنے اس خیال سے باز نہ آئے گا تو قیدخانہ بھیجدیا جائے گا۔ گلیلو نے وعدہ کیا کہ آیندہ وہ ایسا نہیں کریگا اور چلا آیا۔

اس کے بعد تھوڑے عرصہ تک گلیلو خاموش رہا لیکن اتفاق سے دو سال بعد ۱۶۱۸ء میں تین دُمدار ستارے ظاہر ہوئے اور گلیلو نے اپنی رائے ان کے متعلق ظاہر کی۔ اس کی مخالفت فادر گراتسی نے کی اور اس کے جواب میں گلیلو نے ایک مستقل رسالہ تصنیف کرکے شایع کیا جس میں بہ صورت مکالمہ نظام بطلیموس و نظریۂ ارسطو کی تردید کی گئی تھی۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ مذہبی حلقوں میں ہنگامہ بپا ہو گیا اور مذہبی عدالت گاہ میں گلیلو طلب کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجرموں سے زبردستی اقبال جرم کرایا جاتا تھا اور کوڑے مار مار کر خاردار شکنجوں میں دبا دبا کر حالات پوچھے جاتے تھے۔

اس وقت گلیلو کی عمر ۷۰ سال کی تھی اور ہر چند کوئی رکارڈ ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ اس کو اپنی علمی تحقیقات سے باز رکھنے اور اپنے نظریوں سے توبہ کرانے کے لئے کیا کیا سختیاں استعمال کی گئیں، لیکن بہرنوع اس کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نہایت سخت قید تنہائی میں ڈالدیا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ گلیلو کی یہ کمزوری تھی کہ وہ مذہب کے مقابلہ میں ثابت قدم نہ رہ سکا اور تعزیر کے ڈر سے اس نے دونوں مرتبہ اپنے نظریوں سے توبہ کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی کا مقابلہ دانشمندی سے کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ جتنی فرصت اسے مل سکے اس کو ہاتھ سے نہ دے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بہ صورت انکار وہ پہلی مرتبہ فنا کردیا جاتا اور دنیا اس کے علمی اکتشافات سے محروم رہتی۔

ضرورت ہے

نگار مارچ و اپریل ۱۹۳۵ء کے پرچوں کی۔ جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں اطلاع دیں ——— منیجر نگار

فلسفۂ محبت

مشرق و مغرب میں محبت کی جو صدہا تعریفیں کی گئی ہیں اگر اُن کے مفہوم کو اختصار کے ساتھ چند لفظوں میں پیش کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ — محبت نام ہے ایک خالص، بے لوث اور بے غرض انہماک کا۔

پھر محبت کی مختلف تقسیمیں کی گئی ہیں، مثلاً والدین کی محبت، احباب کی محبت، حُسن کی محبت وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دنیا نے کسی انسانی جذبہ کی تحلیل میں اتنی بے راہ روی سے کام نہیں لیا جتنا محبت کی تحلیل میں۔

اوپر جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ حقیقتاً محبت کی صحیح تعریف ہو سکتی ہے لیکن اس تعریف کے لحاظ سے ۹۹ فیصدی محبتیں محبت کی تعریف سے خارج ہو جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بالعموم محبت کو ایک کشش سے عبارت کیا جاتا ہے۔ یعنی جو چیز اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے اور آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اُس سے محبت کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا و ادبا نے تو اس سارے سلسلۂ کائنات ہی کو محبت کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے، اُن کے نزدیک آفتاب، زمین، ستارے، پہاڑ، درخت، دریا غرضکہ کائنات کی ہر چیز کا بقا و قیام ایک غیر شعوری محبت پر مبنی ہے، ہر جرم دوسرے جرم کی طرف ایک فطری کشش رکھتا ہے اور یہی محبت ہے۔ گویا اُن کی دانست میں ساری کائنات کی تفسیر ایک لفظ محبت پر منحصر ہے۔

لیکن اگر آپ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ محبت ایک ایسا مبہم اور غیر واضح لفظ ہے کہ اُس کے تحت میں انسان کے بہت سے مختلف جذبات کو داخل کیا جا سکتا ہے۔

مگر محبت کی ان تمام انواع کے باوجود "صنف نازک کی محبت" ہی صرف ایک ایسی محبت ہے جس نے اس لفظ کو اتنا "ہوشربا" اور "مردافگن" بنا رکھا ہے۔ آپ کسی کے سامنے محبت کا نام لیجئے اور اُسکے تخیل میں ایک رنگین دنیا بس جائے گی، اور اس لئے ہرچند آپ محبت کی ضمن میں والدین یا اعزا و احباب کی محبت کو داخل کریں لیکن اس کا غالب مفہوم وہی ہے جو دو نوجوان دلوں کی دھڑکن میں پنہاں ہوتا ہے۔ مناسب تو یہی ہے کہ اس رومانی لفظ کی پر اسرار لطافت کو تحقیق کی موشگافی سے غارت نہ کیا جائے

اور ولولوں سے بھرے ہوئے دلوں کی شیریں ٹیس کو اُن سے نہ چھینا جائے، وہ رنگین فضا میں رہیں، گلابی ماحول میں جھومیں، سہانے سایہ میں مست رہیں حتیٰ کہ خود بخود اُن کی آنکھوں سے پردہ اُٹھنے لگے لیکن عیش وسکون کی طویل زندگی اور تمدن کی برکات نے محبت کے نام پر دل و دماغ کی بازی لگانے والوں کی تعداد میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جذبہ کو شک وابہام کے دھندلکے سے نکال کر اسکے ایک ایک جزو کو آپ کے سامنے بکھیر دیا جائے تاکہ آپ دیکھ سکیں کہ:۔

"چیست آں شعلہ کہ ایں درجہ حرارت دارد"

افسوس ہے کہ اس جذبہ پر نفسیات کے فاضل مفکرین نے کوئی مبسوط اور جامع بحث نہیں کی، حتیٰ کہ جذبہ شہوت پر بھی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی کافی حد تک تشنۂ تکمیل ہے۔ اور اس لئے آیندہ صفحات میں مختلف مصنفین کی زلہ ربائی کرنے کے بعد میں نے سعی کی ہے کہ اپنی قوت فکر سے کام لے کر ایک مستقل اور جامع مقالہ آپ کے سامنے پیش کروں جس میں اس جذبہ کے متعلق تمام قدیم وجدید تحقیقات کو ایک سلک میں منظم کر کے اُس کے ہر پہلو کو تفصیل کے ساتھ روشنی میں لے آیا جائے۔

بالعموم جن جذبات پر محبت کا اطلاق کیا جاتا ہے اُن کو مندرجۂ ذیل چار انواع میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

۱۔ والدین کی محبت۔

۲۔ بھائی، بہن، اعزا اور احباب کی محبت۔

۳۔ حُسن کی محبت۔

۴۔ صنفِ لطیف کی محبت۔

اب ان میں سے ہر ایک پر ذرا تفصیل کے ساتھ غور کیجئے۔

۱۔ والدین کی محبت:۔

اس محبت کی تحلیل کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ درحقیقت شفقت و رحم کا جذبہ ہوتا ہے جسے غلطی سے محبت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب آپ کے سامنے آپ سے ضعیف تر ہستی عجز و انکسار کے ساتھ دوزانو ہو جاتی ہے، آپ کی سطوت وہیبت کے آگے سرنگوں ہو کر آپ کے روبرو پوری پوری عجز و نیایش کا مظاہرہ کرتی ہے تو آپ کے قلب میں ایک خاص قسم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے ماتحت آپ بیساختہ اُس کی بیکسی سے متاثر ہوتے ہیں، اُسکی مدد کرتے ہیں اور اپنی امکانی طاقتیں اُس کی حمایت میں صرف کر دیتے ہیں۔

بالکل یہی وہ جذبہ ہے جو والدین کو اپنے بچّے کی پرورش اور اُن کی کفالت پر مجبور کرتا ہے۔ پھر بادشاہ

اپنی ضعیف رعایا کے ساتھ، فوجی افسر اپنے مطیع و فرمانبردار سپاہیوں کے ساتھ، ایک آقا غلام کے ساتھ، غرضکہ ہر زبردست اپنے سے زیردست دادخواہ کے ساتھ شفقت و رحم کے ساتھ پیش آتا ہے۔ مگر والدین کی شفقت و رحمت ان تمام شفقتوں سے بدرجہا بلند ہوتی ہے۔ حقیقتہً والدین کی شفقت اس جذبہ کی مکمل ترین صورت ہے بلکہ بعض اوقات تو افراط کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ رہتی شفقت ہی ہے۔

آپ سوال کریں گے کہ "آخر والدین کا جذبۂ شفقت اتنا طاقتور کیوں ہوتا ہے؟" اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے ذیل کی چند مثالوں پر غور کریجئے:۔

ایک مشکیزہ کو پانی سے بھر دیجئے اور پھر اُس میں کسی طرف سے ایک سوراخ کر دیجئے اور دیکھئے کہ پانی کی دھار کتنی طاقت و شدت کے ساتھ باہر نکل رہی ہے لیکن اگر آپ اسی مشکیزہ میں چار پانچ سوراخ اور کر دیں تو آپ دیکھیں گے کہ پانی کے نکلنے میں وہ شدت باقی نہیں رہی حتیٰ کہ اگر آپ اُسکو لاتعداد سوراخوں سے چھلنی کر دیں تو گو پانی اب بھی نکلیگا مگر بہت سست رفتاری کے ساتھ پہلے کی طرح قوت و جھند گی اس میں مطلق نہ رہیگی۔ یہی حال انسانی جذبات کا ہے۔ انسانی سینہ جذبات کا ایک سمندر ہے۔ اگر اُس کو کسی ایک آدھ راستہ سے اپنے کسی جذبہ کے اظہار کا موقعہ ملتا ہے تو وہ دیوانہ نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی ساری ہستی اُس جذبہ کے کہر میں غائب ہوگئی ہے۔ لیکن اگر اسی جذبہ پر چاروں طرف سے مطالبے شروع ہونے لگیں تو پھر اُس کی طاقت گرتے گرتے اُس مشکیزہ کی سی ہو جاتی ہے جس میں سے سوراخوں کی کثرت کے بعد پانی اُچھلکر نکلنے کے بجائے دھیرے دھیرے رستا رہتا ہے۔

اس کی واضح مثال ایک اور طرح سمجھئے:۔

کسی ضعیف و نزار کراہتے ہوئے مریض کو دیکھکر آپ کے دل میں کتنا درد پیدا ہوتا ہے۔ آپ بیقرار ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُس کے آگے بچھ جائیں، اُس کی خدمت میں اپنی جان تک سے دریغ نہ کریں لیکن کسی اسپتال میں وہاں کی نرسوں اور ڈاکٹروں کو جاکر دیکھئے کہ وہ کتنے سکون اور کتنی بے پرواہی کے ساتھ مریضوں کی کراہوں میں بیٹھے رہتے ہیں۔

کسی دم توڑتے ہوئے نوجوان کو دیکھ کر آپ کا دل دہل جاتا ہے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ اُبل پڑتا ہے۔ آپ کے قلب میں درد و سوز کا ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے، دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آپ کے سامنے کھنیچ جاتا ہے، ساری دنیا ایک عبرت گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اسپتالوں کے ڈاکٹر روزانہ کتنے نوجوانوں کو اس طرح دیکھنے کے بعد اپنے قلب میں کرب و اضطراب کی ایک ہلکی سی لہر بھی پیدا ہوتے نہیں پاتے؟۔

یہی حال دنیا میں ہر انسان کا ہے۔ جب کسی جذبہ پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈالا جاتا ہے تو اُس کا ذخیرہ خالی ہو جاتا ہے۔ اور آپ سمجھنے لگتے ہیں کہ اُس انسان میں وہ جذبہ ہی نہیں، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہوتا ہے۔ ہر ڈاکٹر اُتنا ہی دردمند دل رکھتا ہے جتنا آپ، لیکن اس کے باوجود دیکھئے کہ آپ میں اور اُس میں کتنا فرق پیدا ہو گیا!

ایک بادشاہ دن رات رعایا کی فریادیں سُنتا ہے، شب و روز اُن کی کراہ سے دوچار ہوتا ہے اس لئے اُس کے جذبۂ رحم کی شدت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔

اگر زندگی میں آپ کو صرف ایک شکستہ حال فقیر ملتا تو شاید آپ اپنی دولت کا ایک معتدبہ حصہ اُسکی نذر کر دیتے لیکن آپ دن رات اُن کی صدائیں سنتے ہیں اور بے اعتنائی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ ظالم ہو گئے؟

بعینہٖ یہی حال والدین کی شفقت کا ہے۔ اُن کی شفقت اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب بچہ ناتوانی کا ایک مجسمہ بنکر اُن کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ اُس سے آیندہ توقعات، سوسائٹی کی نظروں میں عزت اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اس جذبہ کو شدید سے شدید تر بنا دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ بچہ بڑا ہو جاتا ہے۔ اُس کے بازوؤں میں والدین کی سی سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اب فطری جذبہ کے ماتحت رحم و شفقت یا تو بالکل ختم ہو جاتا ہے یا بہت ضعیف و کمزور حالت میں باقی رہتا ہے۔ دیکھئے! جانوروں میں اُسوقت ماں باپ کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے اور وہ سب ایک سطح پر آجاتے ہیں۔

لیکن انسانی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر بچہ والدین کی خواہشات کے مطابق ہو تو اُن کی شفقت اُس وقت بھی قائم رہتی ہے اگرچہ اس وقت اُس کی ذات سے آرام و راحت پہونچنے اور اسی قسم کے دیگر اُمور کی بنا پر خودغرضی کا ایک جذبہ بھی خاموشی کے ساتھ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اگر بڑے ہونے پر اولاد کے اطوار و عادات والدین کی طبعی اُفتاد کے خلاف ہوتے ہیں تو وہ بعض اوقات اُن کو گھر سے بھی نکال دیتے ہیں، اُنھیں "عاق" کر دیتے ہیں، دنیا بھر میں اُن کی بُرائیاں کرتے ہیں اور صراحۃً اپنے آپ کو اُن سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔

آپ اپنے چاروں طرف مختلف والدین پر ایک نظر ڈال جایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں صرف ایک بچہ ہوتا ہے وہاں شفقت و ایثار اُن والدین کے مقابلہ میں بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے جن کے کئی اولادیں ہوتی ہیں۔

پھر اگر والدین کی توجہات مستقلاً کسی اور طرف بٹی ہوئی ہوں تب بھی بچہ کے ساتھ یہ جذبہ کمزور ہو جاتا ہے

یہی وجہ ہے کہ باپ کی توجہات چونکہ کسبِ معاش کی جانب مبذول رہتی ہیں اس لئے بچہ کے ساتھ اُس کا جذبۂ رأفت بہ نسبت ماں کے بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یوروپ کی ماں کے مشاغل چونکہ ایشیائی ماں کے مقابلہ میں زیادہ متنوع ہوتے ہیں اس لئے جو مادرانہ ایثار و شفقت آپ کو مشرق میں ملیگا وہ آپ مغرب میں نہ پائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ امراء اور رؤسا میں اولاد کے ساتھ وہ والہانہ شفقت نہیں ہوتی جو غربا و فقراء ہی میں پائی جاتی ہے۔ والدین کی طبائع کے اُسی اُتار چڑھاؤ اور مختلف ماؤں اور باپوں کے مختلف سلوک کو دیکھ کر بعض علمائے نفسیات نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ والدین کی محبت بھی فطری نہیں ہوتی۔ لیکن حقیقتہً اُنکی اس رائے میں ایک بنیادی غلطی یہ ہے کہ اُنھوں نے شفقت اور محبت کے دو جدا جدا جذبات کو ایکدوسرے کے ساتھ خلط کر دیا ہے اور اس لئے جب وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں والدین کو اپنے اطاعت شعار بیٹے سے زیادہ محبت ہوتی ہے، سب سے چھوٹی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے، وہ سرکش، خود رائے، ضدی اور بد دماغ بچوں سے علانیہ اپنی بے نیازی کا اعلان کر دیتے ہیں اور تاریخ سے ایسی سیکڑوں مثالوں کا پتہ چلتا ہے جس میں باپ نے بیٹے کو تاج و تخت کی خاطر یا دولت و زر کی طمع میں یا مذہبی اختلافات کی بنا پر قتل تک کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے ـــ تو وہ سمجھتے ہیں کہ والدین کی وہ محبت بھی جس کے اتنے بلند بانگ دعاوی کئے جاتے ہیں درحقیقت ایک تصنع ہے جو خود غرضی کے سایہ میں پرورش پاتا ہے۔ لیکن حقیقت بیں نظریں جانتی ہیں کہ ان علمائے نفسیات کا یہ فیصلہ کس درجہ گمراہ کن ہے۔ اگر وہ "محبت" کے اُس عام لفظ سے دھوکہ میں نہ آجاتے جس کا اطلاق بالعموم ہر "لگاؤ" پر کیا جاتا ہے تو اُن کو معلوم ہوتا کہ ماں اور بیٹے کے درمیان جو رابطۂ موانست ہوتا ہے وہ شفقت و رحم کے جذبہ پر قائم ہوتا ہے نہ کہ محبت پر۔ پھر جس طرح شفقت پیدا ہوتی ہے دوسرے کی کمزوری اور مظلومی کو دیکھ کر اور اُس کی رحم طلب نگاہوں اور عطوفت طلب حال و قال سے اسی طرح وہ اُسوقت فنا بھی ہو جاتی ہے جب یہ چیزیں ختم ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ اگر اولاد میں یہ تمام صفات ایک ایک کر کے ناپید ہو جائیں تو والدین کی شفقت کا آفتاب بھی سیاہ پڑ جاتا ہے اور اُن کے دل کی آگ اپنے بچوں کی طرف سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

الغرض والدین کی محبت جذبۂ شفقت کا دوسرا نام ہے جس کو مستقبل کی خوش آیند توقعات، سوسائٹی کی ہمت افزا نظریں اور عزت افزائیاں زیادہ قوی اور طاقتور بنا دیتی ہیں۔

۲ ـــ بھائی، بہن، اعزا اور احباب کی محبت:۔

اس "تعلق" پر بھی بالعموم محبت کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعتہً اس قسم کے تمام تعلقات کا انحصا

اکثر تو خالص جذبۂ "غرض پرستی" پر منحصر ہوتا ہے اور کبھی ایک ایسے جذبہ پر جو شفقت و غرض پرستی دونوں سے مرکب ہوتا ہے۔

بڑے بھائی، بڑی بہن یا خالو، ماموں، چچا وغیرہ کی محبت بالعموم "غرض پرستی و شفقت" دونوں جذبات سے مرکب ہوتی ہے، لیکن انسان کے ہم عمر دوست احباب اور بھائیوں کی محبت ایک ایسی غرض پرستی کا نتیجہ ہوتی ہے جس میں کسی حد تک جذبۂ ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

لیکن غرض پرستی کا لفظ اتنا نفرت انگیز ہے کہ آپ اس کو باور کرنا شاید بمشکل گوارا کریں گے کہ آپ کے اعزہ و احباب کی محبتیں حقیقۃً خود غرضی کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ چند منٹ اس پر سنجیدگی سے غور کیجئے۔

انسانی دماغ کی ساخت میں دو جدا جدا حصے ہیں جو الگ الگ دو مختلف کیفیات کا مظہر ہیں۔ ایک کیفیت کا نام شعوری ہے اور دوسری کا نیم شعوری یا تحت الشعوری۔

آپ کے سامنے ریاضی کا ایک مسئلہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ کا دماغ اُس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر سمجھ لیتا ہے۔ یہ ہے آپ کے دماغ کی شعوری حرکت۔

لیکن دماغ کی نیم شعوری یا تحت الشعوری حرکات اُن کو کہتے ہیں کہ جن میں آپ کا دماغ علت و معلول کے منطقی سلسلہ سے بےخبر ہو لیکن اس کے باوجود کسی چیز کو جانے، اُس سے بچے یا اُس کی طرف بڑھے۔

آپ کئی مرتبہ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ "ہر مثلث کے کوئی سے دو ضلعے ملکر تیسرے ضلعے سے بڑے ہوتے ہیں"، لیکن آپ نے اس پر کبھی غور نہ کیا ہوگا کہ "حقیقی بہن سے شادی کرنا برا ہے" مگر اس کے باوجود آپ اس دوسری حقیقت پر پہلی حقیقت سے بھی زیادہ اذعان و یقین رکھتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ بچپن سے یہ جملہ اس کثرت کے ساتھ مختلف طریقوں سے آپ کے سامنے دُہرایا گیا کہ رفتہ رفتہ وہ آپ کے دماغ کے شعوری حلقہ سے نکلکر نیم شعوری حلقہ میں چلا گیا۔ اور چونکہ ہر چیز جو یہاں آتی ہی بلا دلیل ہے اس لئے نہ تو اُس کے قیام کے لئے دلیل و حجت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ دلیل و حجت اُس کو نکال سکتی ہے۔

مذہب، سوسائٹی اور جماعت کے تمام فیصلے دھیرے دھیرے آپ کے شعور سے نکلکر تحت الشعور میں پہونچ جاتے ہیں اور پھر خود آپ نہ اُن پر غور کرتے ہیں نہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ جس طرح سوسائٹی نے اُن کو آپ کے دماغ میں نقش کر دیا ہے آپ اُسی طرح اُن کو ماننے پر مجبور ہیں، ڈاکٹر لیبان کہتا ہے کہ "سوسائٹی کے فیصلوں کے آگے انسانی دماغ بالکل بےبس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں مشرق کے باشندے ہر سال مغربی ممالک میں آتے ہیں، یہاں کی تہذیب و تمدن کو دیکھ کر متاثر بھی ہوتے ہیں اور علم و

عقل کی روشنی میں اُن کے خیالات میں کافی اصلاح بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن جب پھر وہ اپنے ملک میں جاتے ہیں تو آہستہ آہستہ پہلے نقوش پھر عود کر آتے ہیں اور وہ بہت جلد اپنے رسم و رواج کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتے ہیں[1]۔

بالکل یہی حال اعزا اور اقربا کی محبت کا ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے[2]۔ اُس کو ضرورت ہے کہ وہ خود دوسروں کی امداد حاصل کرے اور دوسروں کے سامنے اپنی امداد پیش کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اُسکی زندگی خود اُس کے لئے وبال ہو جائے گی۔ اور اس لئے بقائے نفس اور بقائے ذات کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپس میں تعاون و اشتراک سے کام کرے۔ "بقائے نفس" کا یہی وہ جذبہ ہے جس کو ہم نے اوپر خود غرضی سے تعبیر کیا ہے اس لئے کہ اس میں انسان کی ساری کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو زیادہ دیر تک قائم و برقرار رکھے۔

لیکن خالص خود غرضی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ایک مذموم جذبہ ہے اور اُس کے مقابلہ میں ایثار و قربانی ایک جذبۂ محمود۔ سوسائٹی نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ اگر "خود غرضی" کے نام پر انسانی تعاون و اشتراک کو قایم کیا جائے تو اس میں بہت سی تباہ کن صورتیں پیش آجائیں گی اور اس طرح ایثار و قربانی کا وجود ہی دنیا میں باقی نہ رہے گا اس لئے اُس نے نہایت ہوشیاری سے اس جذبہ کا نام محبت و خلوص رکھا۔ اور اس طرح "نظریۂ تکرار"[3] کے ماتحت سوسائٹی نے بچپن سے آپ کے دماغ میں یہ چیز اسدرجہ پیوست کرائی کہ اب آپ میری زبان سے یہ سُننا بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ "آپ کی تمام دوستیاں دراصل خود غرضیاں ہیں"۔

لیکن یہاں یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اعزا و احباب کی محبت میں ہمدردی کا عنصر بھی شامل رہتا ہے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض خاص لوگوں میں یہ جذبہ اتنا ترقی یافتہ ہوتا ہے کہ وہ غرض پرستی کے جذبہ کے بالکل خلاف صرف اسی جذبۂ ہمدردی کے ماتحت نہ صرف احباب و اعزا کا بلکہ سارے عالم کا درد سمیٹ کر اپنے قلب میں بھر لیتے ہیں۔ ملک و ملت کے بلند پایہ لیڈروں میں بالعموم یہی جذبہ اپنی انتہائی طاقت کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔

۳۔ حُسن کی محبت:۔

حُسن کی محبت میں وہ تمام محبتیں داخل ہیں جو ہم کو دنیا کے کسی حسین منظر سے ہو سکتی ہیں، مثلاً تاروں بھری رات سے، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار سے، بہتے ہوئے چشمے سے، چہچہاتی ہوئی بلبلوں سے، کوئل

[1] روح الاجتماع مصنفۂ ڈاکٹر لیبان۔ [2] اخلاق جلالی باب سوم۔ [3] اس نظریہ کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "روح الاجتماع" مصنفۂ ڈاکٹر لیبان

کی کوک سے، اُچھلتے ہوئے پانی سے، خوبصورت پھول سے، لچکتی ہوئی ٹہنیوں سے وغیرہ وغیرہ۔
لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسانی قلب و نظر کا یہ استحسان بھی درحقیقت "محبت" نہیں کہلایا جاسکتا بلکہ اس کے برخلاف اس کا تعلق انسان کی اُس حس سے ہے جس کو "جمالیاتی حس" (Aesthetic sense) کہتے ہیں۔

اس وقت جمالیاتی احساس پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس احساس کے ماتحت ہر حسین و جمیل چیز کو استحسان و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انسان کا یہی جذبہ ایک جداگانہ جذبہ کی حیثیت سے حال ہی میں پہچانا گیا ہے۔ اس سے پہلے لوگ کماحقہ اس سے واقف نہ تھے اور اسی لئے اُنھوں نے اس کو جذبات انسانی کی ایک جدا نوع قرار نہ دیا تھا۔ وہ حسین چیز کو استحسان و پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ضرور تھے مگر وہ اس جذبہ کو محبت کی ذیل میں شامل کرتے تھے۔

قاضی بیضاوی نے ایک جگہ اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "ہر کامل چیز کی جانب قلبِ انسانی کا جو میلان ہوتا ہے اُسے محبت کہتے ہیں"[1]۔ قاضی موصوف کی یہ تعریف ہمارے تمام مشرقی علمائے اخلاق و تصوف کی تحقیقوں اور موشگافیوں کا لب لباب ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس تعریف کے ذریعہ "جمالیاتی احساس" کو محبت کے دائرہ میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے حیرت انگیز مناظر اور خدا کی عظمت کے تصور سے دل میں احترام و مرعوبیت کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے، اُس کو محبت سمجھا گیا ہے لیکن آجکل اس قسم کے تمام جذبات کو "جمالیاتی احساس" کی تحت میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس جذبہ کی تحلیل میں ماہرانِ فن اسوقت تک اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکے ہیں کہ انسان میں ایک ناقابل تحدید اندرونی حس ہے جو ہر چیز کے حُسن و قبح کا معیار مقرر کرتی ہے۔ اسی حس کو ہم بعض اوقات "ذوقِ سلیم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے ماتحت انسان ہر جمیل چیز کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اگر اُس کی یہ حس زیادہ طاقتور ہوجائے تو پھر ہر حسین منظر اُس کے لئے وجد آفریں بنجاتا ہے۔

انسان حالات (Circumstances) اور ماحول کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا ہے اور اُس کے جذبات و خیالات دونوں اُسی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حالات کے اختلاف کی بنا پر لوگوں کے جذبات و خیالات میں بھی زمین آسمان کا اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ "جمالیاتی احساس" بھی اس کلیہ سے مستثنٰی نہیں ہے۔ بعض لوگوں میں یہ جذبہ حد سے زیادہ نشوونما پاجاتا ہے اور وہ شاعر کہلاتے ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی، سورۂ آل عمران۔

وہ سمندر کی لہروں کو دیکھکر جھومنے لگتے ہیں، آبشار کو دیکھ کر مست ہوجاتے ہیں، پپیہے کی "پی کہاں" سے اُنہیں وارفتگی کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن دوسروں پر اس کا بہت کم اثر ہوتا ہے۔

لوگوں نے اس حسن کے سمجھنے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ آپ جنگل میں تنہا گھوم رہے ہیں، صبح کا سہانا وقت ہے۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چل رہے ہیں ۔۔ دفعتہً کسی جھاڑی سے ایک ہرن نکلتا ہے۔ آپ کو دیکھکر ٹھٹک جاتا ہے۔ گردن موڑ کر کچھ دیر آپ کی طرف دیکھتا ہے پھر چوکڑی بھرتا ہوا غائب ہوجاتا ہے ۔۔ آپ کو یہ منظر بہت دلفریب معلوم ہوا۔ اُس کی حسین آنکھیں، اُس کی لمبی گردن اور اُس کی تحیر انگیز نظریں آپ کے قلب پر گہرے نقوش چھوڑ گئیں۔ آپ نے کوشش کرکے اُس کو زندہ پکڑ لیا۔ اور اپنے گھر میں ایک جگہ بند کردیا اور آپ سمجھے کہ آپ نے اُس لطف کو قید کرلیا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ حقیقتہً آپ یہ سمجھے ہی نہیں کہ آپ کے اُس لطف کے اجزاے ترکیبی کیا تھے۔ آپ کو ہرن کا مڑکر دیکھنا اچھا معلوم ہوا۔ آپ نے اسی کا ادراک کیا اور آپ سمجھے بس یہی اس کا حسن ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے آپ پیسٹری کی شیرینی سے متلذذ ہوں اور یہ سمجھ لیں کہ پیسٹری نام ہے شیرینی کا۔

ایک اور مثال لیجئے:۔

ایک حسین پھول ٹہنی پر کھلا ہوا ہے اور ہوا کے نازک جھونکوں سے اُس میں ہلکا ہلکا اہتزاز پیدا ہو رہا ہے ۔ اُس کے چاروں طرف سبز پتے ہیں اور اُس کی خوشگوار خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ آپ اس سے محظوظ ہوکر پھول کو توڑ لیتے ہیں۔ اُسے سونگھتے ہیں، کوٹ میں لگاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ اس طرح آپ نے اُس لطف کو حاصل کرلیا جو پھول کی ٹہنی پر ہونے کی صورت میں تھا؟

حقیقتہً ہرن اس لئے اچھا تھا کہ وہ جنگل کے فطری منظر میں تھا، اور پھول اس لئے خوشنما تھا کہ وہ ٹہنی پر لہلہا رہا تھا۔ آپ اس فلسفہ کو سمجھ نہ سکے اور اُس کے حُسن کو غارت کر بیٹھے۔

ڈارون کے نزدیک جمالیاتی طور پر کسی شے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنا بھی اُس "جنسی جذبہ" کی بنا پر ہوتا ہے جو ہر شخص میں خاموش طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن موجودہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ جمالیات کو "جنسیات" سے کوئی تعلق نہیں ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو ابتداے پیدائش ہی سے رجولیت کی قوتیں لیکر نہ آیا ہو کسی چیز کے حسن و قبح سے متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ حالانکہ وہ بھی ایک جمیل شے سے ٹھیک اُسی طرح اثر پذیر ہوتا ہے جتنا دوسرے۔

خیر یہ تو جمالیاتی احساس کی بحث تھی[1]۔ یہاں کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس قسم کی تمام پسندیدگیاں

[1] جمالیاتی احساس کی مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں فٹ نوٹ صفحہ ۲۳ پر

جن کو جذبۂ محبت کے ماتحت شمار کیا جاتا ہے درحقیقت ایک بالکل مختلف جذبہ سے متعلق ہوتی ہیں۔

۴۔ صنفِ لطیف کی محبت :-

محبت کی یہ نوع بہت دلچسپ ہے۔ لیکن شاید آپ کو مایوسی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ اس محبت کا دارومدار خالص جذبہ "نفسانیت" یا "شہوت پرستی" پر ہوتا ہے۔

انسان کے اور جذبات کے علاوہ اُس کا ایک بڑا طاقتور جذبہ "جذبۂ ہوس رانی" یا "شہوت پرستی" ہے جس طرح ایک بھوکا انسان ہر کھانے کی چیز کے حصول کی کوشش کرتا ہے اسی طرح اس جذبہ کے ماتحت آدمی کی نظر میں ہر عورت ایک بے پناہ جذب و کشش رکھتی ہے۔ اب اگر کوئی عورت حسن ظاہر سے بھی بہرہ مند ہو تو آپ کی "بیقراری" کو جذبۂ ہوس رانی کے علاوہ جمالیاتی احساس بھی تقویت پہونچاتا ہے۔ اور اگر حالات سازگار ہیں اور آپ اپنے "مرکز کشش" تک پہونچ سکتے ہیں تو پھر آپ کے خیالات کی ساری رو صرف اُسی کی جانب مایل ہوجاتی ہے۔ آپ کے جذبات و احساسات میں ایک مرکزیت آجاتی ہے اور آپ اس کا نام عشق یا محبت رکھتے ہیں اس وقت آپ محبوب کے حصول میں مجنوں بنکر آوارۂ دشت و بیاباں ہونا اپنا فخر سمجھتے ہیں، فرہاد کی طرح تیشہ مار کر مرجانے کو حیات جاودانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ چلا اُٹھتے ہیں کہ:-

ما نمے خواہیم ننگ و نام را

آپ کا نفس آپ کو دھوکہ دیتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آپ کی محبت پاکیزہ ہے۔ اور آپ کا جنون مستحسن، حالانکہ جس طرح غصہ کی افراط میں آدمی سرخ ہوجاتا ہے۔ دیوانہ وار چیزوں کو پھینکنے لگتا ہے، میز کے اوپر کی ہر چیز کو منتشر کردیتا ہے اسی طرح آپ کا بھی عالم ہے۔ آپ پر "ہوس رانی" کے جذبہ کی حکمرانی ہے۔ وہ آپ کے تمام دوسرے جذبات و حسیات پر اتنا غالب آچکا ہے کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں اُسی کے ماتحت کرتے ہیں۔ آپ کو چاروں طرف محبوب ہی محبوب نظر آتا ہے۔ آپ روتے ہیں، چیختے ہیں، سر پٹکتے ہیں، کپڑے پھاڑتے ہیں، حتیٰ کہ "دامن کے چاک اور گریباں کے چاک" میں فرق باقی نہیں رہتا۔ پھر خوش قسمتی سے اگر آپ کی تمنا پوری ہوجائے اور آپ کا جذبہ مطمئن، تو رفتہ رفتہ چڑھی ندی اُتر جاتی ہے۔ آندھی ختم ہوچکتی ہے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲ —

1- Dialogues in Aesthetics, by Aristotle.

2- Conquest of Happiness, by B. Russel.

3- Creative intelligence (the last chapter) by J. Dewy.

4- Aesthetics, by Croce.

بادل چھٹ جاتے ہیں اور آپ عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتے ہیں ـــــ ناکامی کی صورت میں بھی آہستہ آہستہ آپ کے خیالات وجذبات کی مرکزیت میں فرق آ جاتا ہے۔ آپ کی توجہ بٹتی جاتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد آپ کے سامنے آپ کا عشق صرف ایک بھولا ہوا افسانہ بنکر آتا ہے۔

یہ ہے آپ کے اُس جذبۂ محبت کی کل کائنات جس نے آپ کی زندگی پر بری طرح قبضہ پا رکھا ہے جو آپ کے شباب کے ساتھ "موت" بنکر آتا ہے اور سیکڑوں طرح کے درد نہاں تقسیم کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔

محبت بیک نظر:-

بعض اوقات صرف "ایک نظر" قلب میں ایک عجیب طوفان بپا کر دیتی ہے اور یہ طوفان اسدرجہ شدید ہوتا ہے کہ بعض مفکرین نے اسی "بنائے محبت" کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ـــــ دنیا میں ہر شخص "زوج" بناکر پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ وہ بہت کم ان دونوں مزدوج اور توام روحوں کو آپس میں ملنے کے اسباب پیدا کرتی ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ زید ہندوستان میں ہے اور اُس کی "توام روح" امریکہ میں ہے۔ اب اگر اتفاق سے یہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ پائیں تو پہلی نظر ہی میں مقناطیسی طور پر ایک دوسرے کی طرف کھنچ جائیں گے۔

"محبت" کی یہ توضیح بہت رومانی اور پُر کیف ہے اور کیسا اچھا ہوتا کہ رعنائی خیال کی اس رنگین وادی سے ہم اپنے آپ کو علٰحدہ نہ کرتے لیکن حقیقت کے چہرہ سے بہر حال نقاب دور کرنا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات ملکر غیر شعوری طور پر کسی جذبہ میں آہستہ آہستہ مشتعل ہونے کی صلاحیت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ پوری طرح اشتعال کے قابل ہو جاتا ہے تو ایک معمولی سے "اُکساؤ" پر بھڑک اُٹھتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر اس فیتلہ میں جس کا ایک سرا "بارودخانہ" سے میلوں دور ہو آگ لگادی جائے تو دھیرے دھیرے سلگتا رہیگا اور بالآخر سلگتے سلگتے جب بارود کے قریب پہونچے گا تو دفعۃً فضا میں شعلے ہی شعلے نظر آئیں گے۔ یا مثلاً اگر بارود "سیلی ہوئی" ہو اور موسم بھی مرطوب ہو تو وہ بدیر آگ پکڑے گی لیکن وہی بارود گرم آب و ہوا میں بالکل مختلف نظر آئے گی۔

آپ دیکھتے ہیں کہ کسی وقت ہم معمولی سی بات پر سخت غضبناک ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کبھی ہمارا جذبۂ غضب اشتعال کے لئے تیار رہتا ہے اور جلد بھڑک اٹھتا ہے اور کبھی تیار نہیں ہوتا اور اس لئے بدیر بھڑکتا ہے۔

یہی حال "محبت بیک نظر" کا ہے۔ آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر عورت میں خاص قسم کی صفات کو بہتر سمجھتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ شام کا وقت ہے۔ آپ باغ میں تنہا بیٹھے ہیں۔ آپ کا دماغ تفکرات سے خالی ہو

اور "جنسی جذبہ" کے مبادیات پوری طرح مکمل ــــ دفعتہً آپ کے سامنے ایک نوجوان لڑکی گزرتی ہے۔ اور اتفاق سے آپ کے اسی "نقطۂ پسندیدگی" پر چٹکی لے لیتی ہے جس کو آپ کے دماغ نے عرصہ سے پکار رکھا تھا۔ اب کیا ہے۔" دل گیا، دین گیا، چین گیا، عیش گیا۔"

نورجہاں کا سادگی کے ساتھ کبوتر اُڑا دینا ایک خاص ماحول میں جہانگیر کے لئے بلائے جان ہوگیا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات آج بھی پیش آتے ہیں۔

برجستگی کے ساتھ صرف ایک شعر پڑھ دینا، خاص تبسم کے ساتھ گردن جھکا دینا، کسی چیز کو لات مار کر گرا دینا "المرطیے" کا بے محل جواب دینا، کتاب کو اُٹھا کر پھینکدینا، چائے کی پیالی کو دیتے وقت ذرا جھٹکا دیکر چھلکا دینا، پان کی تھالی کو خفیف مسکراہٹ کے ساتھ منھ پھیر کر آگے کو بڑھا دینا ــــ اس قسم کے سیکڑوں واقعات آپ کے سنجیدہ ترین لمحوں میں کوئی قیمت نہیں رکھتے لیکن انھیں میں سے کچھ ہیں جن کے تیر ہمارے ہزاروں نوجوانوں کے دلوں کو چھلنی کئے ہوئے ہیں۔

بعض اوقات آنکھ، بال، چہرہ کی ساخت، بازوؤں کی گولائی، رفتار کی نوعیت وغیرہ وغیرہ آپ کی "جنسیت" کے نیم پختہ احساس کو دفعتہً پختہ کردیتے ہیں۔ اور گو کسی لڑکی میں ہزاروں ہزاروں عیب ہوں لیکن صرف ایک چیز کی دلکشی آپ کے خرمنِ قلب پر بجلی بنکر گر پڑتی ہے۔

المختصر اس قسم کی محبت بھی درحقیقت محض "جذبۂ شہوت" کا نتیجہ ہوتی ہے جسکو "جمالیاتی احساس" قوی تر بنا دیتا ہے۔ اور اس لئے دیگر جذبات کی طرح ابتداءً نہایت شدید ہوتی ہے لیکن بہت جلد فنا ہو جاتی ہے ــــ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ "صنفِ لطیف کی محبت" کی کامیاب ترین شکل "ازدواج محبت" ہے چند منٹ اس پر بھی غور کیجئے:-

ازدواجِ محبت:-

"ازدواجِ محبت" سے بالعموم جو مفہوم سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "مناکحت سے پہلے نوجوان زوجین آپس میں ایکدوسرے کی طرف غیر معمولی کشش پاتے ہوں۔" عام طور پر اس جذبہ کا نام "محبت" رکھا جاتا ہے لیکن ہماری مذکورہ بالا تقریر کو پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ "ازدواجِ محبت کی بنیادیں جس جذبہ پر قائم ہوتی ہیں وہ درحقیقت مرکب ہوتا ہے نفسانیت اور جمالیاتی احساس سے۔"

پھر جس طرح انسان کے تمام جذبات تغیر پذیر اور فانی ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اُن میں پژمردگی اور اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح ان جذبات کا حال ہے۔ ازدواج سے پہلے زوجین ایکدوسرے کے اتصال کو فردوس سمجھتے ہیں اور اُن کے قلب کی گہرائیوں سے یہ چیخ اُٹھتی ہے کہ:-

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

چنانچہ اگر وہ اپنی تمناؤں میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ کائنات کی ساری مسرتیں اُنکو حاصل ہوگئیں۔ اور زندگی کے رنج والم کا احساس اب کبھی اُن کے قلب پر گذر نہ پائے گا۔ لیکن بہت جلد ہی اُنکی آنکھوں سے پردے اُٹھنا شروع ہوتے ہیں، نشہ اُترتا ہے اور اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں عام انسانوں سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شوپنہار کہتا ہے کہ ازدواجِ محبت ہمیشہ ناکام ہوتا ہے[1]۔ عام ازدواجوں کی بنیاد رواداری اور اعتماد پر قائم ہوتی ہے۔ اور ابتدا سے دونوں یہ سمجھ کر ایک گھر میں قدم رکھتے ہیں کہ اب اُن کو زندگی بھر ایکدوسرے کے ساتھ نباہنا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف کیوپڈ کے مارے ہوئے زوجین لیلےٰ مجنوں بنکر زندگی کی سرسبز وادی میں داخل ہوتے ہیں، گلابی فضا میں اُڑتے ہیں۔ رنگین لہروں میں ناچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُنکی مسرتوں کا یہ ذخیرہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اُن میں سے ہر ایک "پرستش و سجود" بنا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جب جذبات کی سیلابی میں کمی آتی ہے، اُن کا دلچسپ خواب ختم ہوتا ہے، آنکھ کھلتی ہے، اور دنیا کی تلخ حقیقتیں اپنے چہرہ کو اُن کے سامنے بے نقاب کرتی ہیں تو اُن کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایکمرتبہ پھر اُسی طرح سوجائیں اور اُسی خواب کو پھر دیکھنے لگیں لیکن وہ اس میں ناکام رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کو تغافل و بے اعتنائی کا مجرم قرار دیتا ہے، اور خانگی و معاشرتی زندگی روز بروز تلخ سے تلخ تر ہوتی جاتی ہے۔

حُسن کو دیکھکر انسان مرعوب و متاثر ہوتا ہے۔ اور فطرتاً اُس کے دل میں اُس سے پوری پوری طرح لطف اندوز ہونے کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے۔ اب اگر محبوب بھی التفات سے پیش آنے لگے۔ یا کم ازکم "جان بوجھکر" "بے اعتنائی ہی برتے تو آپ کی یہ آتشِ اشتیاق تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اور آپ یہی کہہ کہہ کر اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں کہ :-

غصہ سے دیکھتے ہیں مگر دیکھتے تو ہیں،
خوش ہوں کہ ہوں تو میں بھی کسی کی نگاہ میں

لیکن شادی ان تمام جذبات کا مآل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ میں تو یہاں تک یقین رکھتا ہوں کہ خود مجنوں لیلےٰ

[1] ملاحظہ :- Story of Philosophy by W. Durant

سے لڑتا اگر وہ دونوں سلک ازدواج میں منسلک کر دئے جاتے۔

نارما شیرر، کانسٹنس بینیٹ، سلوچنا اور زبیدہ دُنیا کی اُن حسین عورتوں میں ہیں جن کے مثیل بہت کم ملیں گے۔ اور آپ میں سے ہر شخص اُن کے خدوخال کی رعنائی اور اُن کے اعضا و جوارح کی جنبش کو فدا ہوجانے کی حد تک پسند کرتا ہے اور شاید آپ پر شادیِ مرگ طاری ہوجائے اگر حالات آپ کے اتنے مساعد ہوجائیں کہ آپ اُن سے ہمیشہ کے لئے قریب ہوسکیں۔ لیکن اس کے باوجود باور کیجئے کہ ان کے ساتھ آپ کا ازدواج دنیا میں ناکام ترین ازدواج ہوگا۔

آپ کے شہر کی وہ غریب لڑکی جس کے پاس نہ دولت ہے نہ حُسن آپ کے ازدواج کو نارما شیرر اور سلوچنا کے ازدواج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کامیاب اور فائز المرام بنا سکتی ہے اس لئے کہ پہلے ازدواج کی بنیادیں معاشرتی حقیقتوں کی بھرپور روشنی میں رکھی جائیں گی اور اُسی میں ہمیشہ رہیں گی۔ لیکن دوسرا ازدواج صبح کے ٹھنڈے اور سہانے سماں میں منعقد ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ وقت بہت جلد ختم ہوجانے والا ہے۔

ایک دفعہ ایک نوجوان لڑکی نے نہایت دردناک لہجہ میں میرے سامنے اپنے شوہر کی شکایت کی، حالانکہ میرے نقطۂ نگاہ سے اُس کے شوہر میں کوئی بات بھی عام شوہروں کے مقابلہ میں کم نہ تھی۔ وہ نہ اُس پر غیر معمولی سختی کرتا تھا اور نہ ادائے کفاف میں کوئی تساہل برتتا تھا۔ لیکن جب میں نے اپنا یہ خیال اُس لڑکی پر ظاہر کیا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اُس نے حسرت و یاس کے بیشمار تاثرات کے ساتھ مجھے یہ جواب دیا کہ:-

"آپ کو کیا معلوم کہ ہم نے کس طرح زندگی شروع کی تھی۔ ہم لیلےٰ مجنوں تھے ......"

اُس کی زندگی کی طویل داستان کو اس مختصر سے جملہ میں سُنکر مجھے افسوس ضرور ہوا مگر میں اُسے یہ نہ سمجھا سکا کہ فطرتاً یونہی ہونا چاہئے تھا۔

جن لوگوں کو دنیائے فلم سے دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ میری پکفورڈ اور کانسٹنس بینٹ جیسی غیر معمولی حسین لڑکیوں کے ازدواج کتنے مایوس کن ثابت ہوئے ہیں۔

اسی وجہ سے ایک طبقہ کی یہ رائے ہے کہ "شادی محبت کی موت ہے۔ اس لئے محبت میں شادی نہ کرنا چاہئے"۔ لیکن اُن کا یہ فیصلہ بھی اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ محبت کو ایک "الوہی جذبہ" سمجھتے ہیں۔ اور اسلئے محبت ہوجانے پر اُن کا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ "چونکہ شادی کرنے سے یہ "الوہیت" فنا ہوجائے گی اس لئے شادی نہ کیجائے"۔ لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ جس طرح انسانی جذبات کا طوفان سکون و اطمینان پالینے کے بعد ختم ہوجاتا ہے اسی طرح کمل ناکامی و یاس کے بعد بھی رفتہ رفتہ وہ فنا ہوجاتا ہے۔ اور اس لئے اگر

آپ کو کسی لڑکی سے محبت ہے اور شدید محبت ہے لیکن اس کے علی الرغم اُس کی شادی کسی دوسری جگہ ہوجاتی ہے تو ممکن ہے کہ آپ کچھ دنوں تک دیوانے رہیں۔ لیکن اگر آپ کا دماغ عام انسانوں کی طرح حالت اعتدال میں (normal) ہے تو پھر آہستہ آہستہ آپ کے اور آپ کی "مرکز نگاہ" کے درمیان غیریت و اجنبیت کا ایک پردہ حائل ہوتا جائے گا۔ اور آپ کی محبت کا جوش ہمیشہ کے لئے رخصت۔

اور اس لئے وہ لوگ صریح غلطی پر ہیں جو محبت کو تکمیل انسانیت کا ذریعہ سمجھ کر اُس کو صرف ہجر کی کراہ میں باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی محبت انسانی فطرت کے بالکل منافی ہے۔ بلکہ فطرت کے خلاف ایک ایسی بغاوت ہے جس میں باغی کی تباہیاں یقینی ہیں۔

محبت کا صحیح مفہوم:۔

اِن تمام بحثوں کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آیا حقیقۃً محبت کا وجود دنیا میں ہے بھی یا نہیں، یعنی وہ محبت جس کی تعریف ابتدا میں بیان کی گئی ہے ـــــــ "ایک خالص، بے غرض اور بے لوث انہماک"۔ اس تعریف پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ باہم دو شخصوں میں ہر اعتبار سے حقیقی اتحاد پایا جائے۔ "حقیقی اتحاد" سے میرا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جذبات و احساسات، خیالات و مشاعر، امیال و عواطف اور طبعی ذوق آپس میں اسدرجہ متحد ہوں کہ کسی مسئلہ میں ایکدوسرے کے ساتھ اُنکا اختلاف ممکن نہ ہو۔

لیکن دنیا میں اس قسم کے اتحاد کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، دو سبب سے، اول تو دو انسانوں میں اس قسم کا مکمل اور تام اتحاد ہوتا ہی بہت کم ہے، دوسرے اگر ہوتا بھی ہے تو پھر یہ کیا ضروری ہے کہ اس قسم کے دو شخص آپس میں ایک دوسرے سے متعارف بھی ہوں۔ گوئٹے کہتا ہے کہ حافظ کے خیالات مجھ سے اسدرجہ متحد ہیں کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں میری ہی روح تو حافظ کے قالب میں نہ پھونک دی گئی تھی۔ لیکن گوئٹے اور حافظ میں مکانی اور زمانی دونوں اعتبار سے جو بعد تھا وہ ظاہر ہے۔

اس اتحاد کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مرد و عورت ہی کے درمیان ہو بلکہ جس طرح وہ مرد و عورت کے مابین ہو سکتا ہے اسی طرح دو مردوں یا دو عورتوں کے درمیان بھی ممکن ہے۔

میرے نزدیک حقیقی محبت اسی اتحاد کا نام ہے۔

اگرچہ دنیا میں ایسے خوش نصیب لوگ پائے جاتے ہیں جن کو یہ اتحاد اپنے مرد دوستوں میں سے کسی ایک میں نصیب ہوجائے لیکن ایسے نفوس کی تعداد بہت کم ملے گی جہاں اس اتحاد کا مرکز جنسِ مقابل کا کوئی فرد ہو۔

اس قسم کا اتحاد درحقیقت بہت طویل تعلقات اور مراسم کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ جب دو قلب آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان لیتے ہیں اور بالآخر ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ایک کی تکمیل دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔

لیکن اس اتحاد میں ایک خاص چیز قابل غور ہے۔

شوپنہار کہتا ہے:۔

"دو دل صحیح معنی میں اُسی وقت محبت سے متحد ہو سکتے ہیں جب اُن میں سے ایک کی کمی دوسرا پوری کرے"[1]

زیادہ واضح الفاظ میں اس کو یوں سمجھئے کہ دونوں کے مزاج کچھ اس قسم کے ہوں کہ اگر ایک میں غیر معمولی کرختگی و سختی ہے تو دوسرے میں اُسی تناسب سے اتنا لوچ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے دوست کے مزاج کی اس ناخوشگواری کو برداشت کر سکے۔ اگر ایک دوست جلد باز اور زود رنج ہے تو دوسرے کو اتنا مستقل مزاج اور ذی شعور ہونا چاہئے کہ وہ اپنے رفیق کی مناسب مدد کر سکے۔ اگر ایک کی طبیعت میں احمقانہ ظرافت و شوخی ہے تو دوسرے کو ایک معین حد تک سنجیدہ ظرافت کا حامل ہونا چاہئے، اگر ایک ہر وقت باتیں کرنے کا شائق ہے تو دوسرے کو اُس کی باتوں کے سننے میں لطف آنا چاہئے ——— غرضکہ اُن دونوں مزاجوں کی نوعیت ایسی ہونا چاہئے کہ اگر اُن دونوں کو ملا کر ایک نیا مرکب تیار کیا جائے تو ایک مکمل ترین انسان کی تشکیل ہو سکے۔

لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں ایک دوسرے کے مزاج میں اتنا لوچ ہونا چاہئے وہاں اس کی بھی ضرورت ہے کہ دونوں کے امیال و عواطف متضاد نہ ہوں اور نہ اُن کے رجحاناتِ طبعی میں باہم کوئی بنیادی اختلاف ہو۔ اُن کے عزائم و مقاصد، اعتقادات و خیالات، تصورات و مشاعر غرضکہ اُن کی ساری ذہنی زندگی ایک دوسرے سے کہیں نہ ٹکراتی ہو۔ گویا یوں سمجھئے کہ اُن دونوں کے مزاج و طبیعت کے اہم پہلو آپس میں یکساں ہوں۔ اور گو بظاہر اُن میں اختلاف نظر آئے لیکن درحقیقت دونوں میں ایک ہی قسم کی "برقی رو" دوڑ رہی ہو، دونوں کی طبیعت ایک یکساں شعلہ سے حرارت پذیر ہو اور دونوں کے مزاج کے بنیادی اُصول بالکل ایک ہوں۔

بات یہ ہے کہ انسانی نفسیات کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ انسان ہمیشہ اُس چیز کو مستحسن و پسندیدہ سمجھتا ہے جو خود اُس کے پاس موجود نہ ہو بشرطیکہ اُس کے امیال و عواطف کے اعتبار سے اُسے اُس چیز کے خلاف کوئی طبعی عناد نہ ہو بلکہ وہ ہر وقت اُس کے حصول کا متمنی رہے مثلاً اگر آپ آزاد خیال اور روشن ضمیر بننے کے آرزومند اور سوسائٹی کی تمام

---

[1] ملاحظہ ہو:۔ Story of Philosophy. by W. Durant

دقیانوسی اور قدیم رسم و رواج کے خلاف مستقل بغاوت کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں تو آپ کو اُس دوست کی معیت بہت پُرلطف معلوم ہوگی جو اِن صفات سے متصف ہو۔ لیکن اگر آپ بذاتِ خود کہنہ اور فرسودہ خیالات کے حامی ہوں تو پھر کوئی بلند نظر اور وسیع المشرب انسان آپ کی دوستی کے لئے موزوں نہ ہوگا۔

ایک دوسری مثال لیجئے:۔

گورے رنگ کو آپ حسین ترین سمجھتے ہیں لیکن افریقہ کے کسی حبشی سے پوچھئے کہ اُس کے نزدیک ایک سیاہ چمکیلے جسم کے مقابلہ میں گورے رنگ کی کیا وقعت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص آب و ہوا اور ماحول کے اثر سے اُس کے ذہن و دماغ میں سیاہ رنگ کی زیبائی و رعنائی اس درجہ پیوست ہو چکی ہے کہ اب اُس کے نزدیک کلیوپیٹرا بھی ایک حبشی لڑکی کے مقابلہ میں درخورِ اعتنا نہیں ہو سکتی۔

بہر حال دو طبیعتوں کے کلّی اتحاد کے ساتھ ساتھ یہ جزئی اختلاف انسانی محبت کو استوار کرنے کے لئے لازمی ہے یعنی بحیثیت مجموعی ایک کی طبیعت کے تمام پہلو دوسرے کی طبیعت کے تمام پہلوؤں کے ساتھ اتحادِ تام رکھتے ہوں مگر ایک فریق جن اُمور میں کامل ہو دوسرا بھی اُن کے حصول کا ساعی ہو اور اس لئے ایک سنجیدہ اور خاموش انسان کسی ظریف و پُر شور شخص کا دوست بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ ظرافت سے لطف اندوز ہونا جانتا ہو۔ اپنے دوست کی ظرافت کے باریک نکات کی قدر کرتا ہو اور اُسے زندگی میں ایک مفید فعل سمجھتا ہو ——— "دالاّ فلا"

لیکن اگر اس کے برخلاف اگر آپ کی سنجیدگی اس درجہ پر پہونچ جائے کہ آپ اپنے دوست کی ظرافت کی قدر نہ کر سکیں، اُس کو داد نہ دے سکیں۔ اُس کے لطائف کے گہرے نکات کو نہ سمجھ سکیں تو آپ دونوں میں کبھی بھی اتصالِ حقیقی صورت پذیر نہ ہو سکیگا۔ مثلاً اگر ایک خشک فلسفی کو جوان کرانوڑ سے ملا دیا جائے تو زیادہ عرصہ نہ گزرنے پائیگا کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے متنفر نظر آئیں گے۔

ان تمام بحثوں کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد محبت کے مسئلہ میں ہم جس نتیجہ پر پہونچتے ہیں وہ یہ ہے کہ:۔

"محبت نام ہے ایک خالص، بے لوث اور بے غرض انہماک کا جو دو شخصوں کے امیال و عواطف جذبات و رجحانات اور احساسات و مشاعر کے حقیقی اتحاد و اتصال کے بعد پیدا ہوتا ہے"

اس تعریف کے ماتحت محبت میں مرد و عورت کی تخصیص باقی نہیں رہتی۔ لیکن اگر خوش قسمتی سے یہ اتصال دو مقابل جنسوں میں ظہور پذیر ہو تو پھر اس کو "جذبۂ نفسانی" کی تائید بھی حاصل ہو جاتی ہے ——— پھر اگر جنسِ مقابل ثروتِ حسن سے بھی بہرہ مند ہو تو انسان کا "جمالیاتی احساس" اس محبت کو اور زیادہ تقویت پہونچا کر اس شراب کو سہ آتشہ بنا دیتا ہے ——— مگر یہ تینوں چیزیں ——— طبائع، اختلافِ جنسیت اور حسن ——— شاذ و نادر ہی جمع ہوتی ہیں۔ لیکن اگر خوش نصیبی سے کبھی جمع ہو جائیں تو پھر دنیا ایک فردوس ہوتی ہے اور زندگی کی تمام لذتیں سمٹ کر اس "مبارک اتحاد" میں جمع ہو جاتی

ہیں۔ اور یہی وہ مرتبہ ہوتا ہے جب انسان کو کائنات کے ہر ذرہ میں ایک "الوہی نشاط" کا جلوہ نظر آتا ہے اور زندگی کا ہر سانس اُس کے لئے ایک مستقل نوید بہار ہوتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں اس قسم کی مکمل محبتیں بہت کم نظر پڑتی ہیں تاہم مثال کے طور پر براؤننگ اور ایلزبتھ یا میڈم کوری اور اُس کے شوہر کی محبت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

محبت کے متعلق ان تمام ابحاث کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل منطقی نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں:۔

۱۔ محبت دو نگاہوں کے بیک وقت ملنے یا غیر معمولی حسن کو دیکھنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ نتیجہ ہوتی ہے ایک طویل صحبت و ہمکلامی کا۔

۲۔ محبت میں حسن اور جذباتِ نفسانی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ محبت ایک مرتبہ مستحکم ہو جانے کے بعد پھر کبھی ختم نہیں ہوتی۔

۴۔ محبت اپنے ساتھ ایک ابدی سکون و سرور لیکر آتی ہے اور زندگی کو اُس کے تمام مصائب و آلام کے باوجود ہمیشہ کے لئے خوشگوار بنا دیتی ہے۔

لیکن ممکن ہے کہ فطرت کی یہ گرانمایہ ترین نعمت اپنے پورے جلوؤں کے ساتھ یورپ میں نصیب ہوسکے مشرق میں تو اس کی توقع فضول ہے اس لئے کہ یہاں مرد و عورت کی دماغی اور ذہنی تربیت میں اتنا اختلاف ہے کہ وہ دونوں کبھی صحیح معنے میں "اتحاد طبائع" کے حامل نہیں بن سکتے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ محبت کا گوہر لطیف مشرق کے ریگزار میں دستیاب نہیں ہوسکتا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم میں اس جذبہ کے پرورش و ارتقا کی سرے سے صلاحیت ہی مفقود ہے۔ اس کے برخلاف ہم اس جذبہ سے متاثر ہونے کی اتنی ہی صلاحیت رکھتے ہیں جتنی دنیا کے کرہ پر کسی ایک انسان کو بھی حاصل ہے۔ لیکن جس طرح آپ دہلی میں بیٹھکر ٹوکیو اور نیویارک کے کسی باشندے سے رابطۂ اُلفت و محبت پیدا نہیں کرسکتے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ ہمارے رسم و رواج کی پیدا کردہ خلیجوں کے باوجود جو ہماری اور عورت کی بے تکلف ملاقاتوں میں حائل ہیں اس جذبہ کی نشوونما کرسکیں۔

چونکہ ہم نے محبت کی بہت غلط تعریفیں ذہن نشین کر رکھی ہیں اس لئے ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اُن کے اور اُن کی بیویوں کے درمیان کامل اتحاد و محبت ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ایک لاکھ شریف گھرانوں میں سے شاید ایک گھر بھی ایسا نہ نکل سکے جہاں زوجین میں صحیح رابطۂ موانست و محبت ہو۔ بالعموم "رواداری" اور "یکطرفہ پرستش" ہے جس کو ہم غلطی سے محبت سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

محبت میں ضروری ہے کہ محب و محبوب دونوں ایک دوسرے کی صحیح قدر کریں اور ایک دوسرے کی

واقعی قیمت کو جانتے ہوئے اُس کو عزیز رکھیں۔ لیکن اگر آپ روشن دماغ ہیں، سنجیدہ اور ذہین ہیں، بہترین لیکچرار اور مقرر ہیں، فلسفہ کے باریک اور دقیق مسائل میں موشگافیاں کرنا خوب جانتے ہیں، نہایت پاکیزہ ذوقِ ادب رکھتے ہیں، اعلےٰ پایہ کے شاعر و انشا پرداز ہیں ـــ تو دنیا میں سب سے پہلی شخصیت جو آپ کے اِن تمام کمالات کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیگی، جو آپ کی مایۂ فخر استعدادوں پر تمسخر اُڑائیگی اور جو آپ کی صحیح حیثیت سے ہمیشہ ناواقف رہیگی وہ آپ کی بیوی ہوگی[1]

ایک دفعہ میرے ایک دوست کو یہ خبط پیدا ہو گیا کہ اُن کے ازدواج کی بنیاد محبت پر ہونا چاہئے۔ اور بدقسمتی سے وہ ہندوستان ہی میں اپنے اس عزم کی تکمیل بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اپنی اس کوشش میں اُنھوں نے دیکھا کہ اس وادی میں اُن سے کہیں زیادہ کامیاب ایسے نوجوان ہیں جن کا اخلاق و ضمیر گندہ ترین ہے اور جن کے رومان کا تمام تر انحصار صرف مکر و فریب اور اسی قسم کے سیکڑوں حیا سوز جرائم پر ہوتا ہے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ وہ نوجوان جن سے عام مجالس و محافل میں وہ مصافحہ کرنا بھی اپنی پاکیزگیِ نفس کی توہین سمجھتے تھے اس میدان میں اُن کے شریکِ مسابقت ہیں۔ تاہم ایک مستقل مزاج "طلبگار" کی حیثیت سے اُنھوں نے اپنی مساعی کو جاری رکھا۔ لیکن جب مسلسل تجربوں کے بعد اُن کو یہ معلوم ہوا کہ ہر بارگاہ سے اُن کا سرِ نیاز صرف اس لئے ٹھکرا دیا جاتا ہے کہ اُنکے اعضاء و جوارح میں وہ ورزشی طاقتیں جمع نہیں ہیں جو ایک بیفکر ہوا پرست ہی میں پائی جا سکتی ہیں تو جنت سے نکالے ہوئے آدم کی طرح اُن کو بصد یاس و ناکامی اس بوستانِ محبوبی سے واپس آنا پڑا۔ چنانچہ اُنکی بیکسی کے خیال سے میرا دل اب بھی تڑپ اُٹھتا ہے جب میں اُن کے ان حسرت آگیں جملوں کو یاد کرتا ہوں کہ ـــ

"ہماری سوسائٹی میں ایک مرد کی عظیم ترین ذاتی صلاحیتوں کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر نوجوان لڑکی اُس سے نفرت کرے اور بے تکلف صحبتوں میں اُسے اپنے لئے وبال سمجھے......"

اس کے مقابلہ میں ایک مغربی سائنٹسٹ کا یہ قول یاد کیجئے کہ "...... شادی سے پہلے میں اور میری ہونے والی بیوی کئی کئی دن مسلسل اختبار خانہ کے ایک کمرہ کے اندر کسی علمی تجربہ میں ہمہ تن منہمک رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بحث کرتے رہے ہیں لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس دوران میں ہم نے ایکدوسرے کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔"

بہرحال مشرق میں مرد و زن کا اتصال موقوف ہوتا ہے صرف جذبۂ جنسی اور رواداری پر جس میں عورت کی جانب سے "نیایش و پرستش" کا عنصر ایک اہم ترین حیثیت رکھتا ہے۔

ہم جس زندگی کو بسر کر رہے ہیں وہ ایک ایسی ٹھوس، بے مغز اور بے کیف زندگی ہے جس کی ساری لذتیں

[1] اس موضوع پر مصر کے مشہور فاضل قاسم بک امین نے اپنی کتاب "تحریر المرأۃ" میں بہت فاضلانہ اور پراز معلومات بحث کی ہے۔

سلب کرلی گئی ہیں اور گو ہم دن رات محبت کا راگ الاپتے رہیں لیکن آپ نے دیکھا کہ حقیقتاً محبت سے ہمیں کوئی دور کا علاقہ بھی نہیں۔ قفس کی اُس چڑیا کی طرح جس کے بازو اُڑنا بھول چکے ہوں ہم محبت کے مفہوم سے قطعاً ناآشنا ہو چکے ہیں، ہماری گفتگو "خوش ذوقی"، ادبیت، شاعری غرضکہ سب کچھ خالص "نفسانیت" پر مبنی ہوتی ہے۔ گو کبھی کبھی "جمالیاتی ذوق" کے ترانے بھی کانوں میں پڑ جاتے ہیں مگر وہ چیز جس کو "زندگی کی بجلی" کہتے ہیں، ہم سے مفقود ہو چکی ہے۔

میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں کامیاب محبت صرف اُس لڑکی سے کیجا سکتی ہے۔ جس کی طبعی شوخی سے تمام گھر نالاں ہو، جس کی بیباکیاں گھر کی چہار دیواری کو عبور کر کے باہر تک پہونچ چکی ہوں۔ اور جس کی اخلاقی حالت اتنی مشتبہ ہو کہ کوئی شریف انسان اُس کو رفیق حیات بنانے کے لئے تیار نہ ہو"

میں نے پوچھا:— "کیوں؟"

کہنے لگے:— "حقیقتہً یہ لڑکی جنیس (Genius) ہوتی ہے۔ موجودہ معاشرت کی تنگ و تاریک کوٹھری میں اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ اپنی بیقرار طبیعت سے مجبور ہو کر قفس کی ان تیلیوں کو توڑ ڈالتی ہے وہ اپنے سینہ میں طوفانی موجوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتی اور بالآخر اُس کے رُکے ہوئے احساسات شرار بنکر ہر امکانی روزن سے آتش فشاں مادہ کی طرح پھوٹ پڑتے ہیں۔

وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ:— "سوسائٹی کی یہی لڑکیاں ہیں جن کو اگر صحیح تربیت دیجاتی تو وہ لینن اور نپولین کی طرح دنیا کے طول و عرض پر چھا جاتیں"

بہر حال یہ صحیح ہو یا غلط اتنا ضرور صحیح ہے کہ ہماری موجودہ معاشرت میں مرد و عورت کے دماغی توازن میں اختلاف تربیت کی بنا پر اتنا عظیم اختلاف ہو گیا کہ ان دونوں میں باہم گر محبت کا جذبہ نشو و نما نہیں پا سکتا۔

کاش انسان اُسی دور وحشت میں رہتا جب مرد و عورت دونوں ایک آسمان کے نیچے کھیلتے تھے، اور فطرت کے ایک اُستاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ ایک طرح کی ذہنی و طبعی تربیت پاتے تھے اور اس طرح آپس میں زندگی کے گراں سے گراں بار کو رنگینیوں اور مسرتوں میں تبدیل کرسکتے تھے۔ کاش ہم اُن آزاد چڑیوں کی طرح خوش رہتے جو اپنے آشیانہ میں دنیا کے لطف و انبساط کا عطر نچوڑ کر بیٹھی رہتی ہیں اور کائنات کی بڑی سے بڑی خوشی اُن کے دو دھڑکتے ہوئے دلوں میں چمکتی نظر آتی ہے!! —— کاش خدا ہم کو پھر ہزاروں سال پیچھے لوٹا دے۔ یا مشرقی مرد کو اتنی صلاحیت دے کہ وہ عورت کو محض "کنیز" بنا کر زندگی کی یہ تنہا مسرت ہم سے نہ چھینے۔ کاش اُسے ہوش آئے —— اس سے پہلے کہ ان وادیوں میں موت کے قہقہے گونجیں!!

سید ابو سعید بزمی، ایم۔ اے

افسانہ کی تکمیل

احمد سعید ٹرکی کا مشہور افسانہ نویس اپنے کمرہ میں میز پر بیٹھا ہوا ایک افسانہ کی تکمیل میں محو ہے۔

ہیرو گاؤں کے ایک مکان میں تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ یہ مکان عام آبادی سے علاوہ ایک میدان میں واقع ہے تقریبًا نصف شب گزر چکی ہے۔ وہ کچھ سراسیمہ نظر آرہا ہے۔ خوف زدہ...... بے انتہا خوف زدہ۔۔

چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے کوئی آدمی نظر آتا ہے نہ حفاظت کا کوئی دوسرا سامان۔ ایک چھڑی بھی موجود نہ تھی جدید آہنی یا آتشیں آلات کا کیا ذکر۔ اس حال میں وہ بے حد متوحش نظر آتا ہے اور بالآخر مایوس ہوکر میز پر کہنی ٹیک کر بیٹھ جاتا ہے۔

سعید کا قلم یہاں پہونچکر رک جاتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس جگہ افسانہ میں کسی ایسے واقعہ کو پیش کرے جو ناظرین کو فورًا متوجہ کرے۔ لیکن اس کی ساری ذہانت بیکار ثابت ہو رہی تھی اس نے ہزار سر مارا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی وہ اسی فکر میں محو تھا کہ ایک شخص کمرہ میں داخل ہوا۔۔۔ دراز قد۔ مضبوط اعضاء۔ چہرہ پر لانبی اور گھنی داڑھی۔ ہاتھ میں بھرا ہوا پستول۔ سعید کو اسوقت تک مطلقًا خبر نہ ہوئی جب تک کہ آنے والے کی مہیب آواز نے اسے چونکا نہ دیا۔

اجنبی ۔۔۔ تم کیا کر رہے ہو۔

سعید ۔۔۔ لکھ رہا ہوں۔ لیکن تمھیں میرا نام کس طرح معلوم ہوگیا۔ میں تو تمھیں پہچانتا بھی نہیں۔

اجنبی ۔۔۔ تمھیں پہچاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمھاری تصنیفات ایک ایک کرکے میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ تمھیں کیا خبر کہ تم کس شہرت کے مالک ہو۔ ملک کا بچہ بچہ تم سے واقف ہے۔ تمھاری جائے قیام کی جستجو میں مجھے سخت دقتیں پیش آئیں۔ میری کتنی خوش نصیبی ہے کہ اسوقت تم بالکل تنہا ہو تمھارے ملازم تم سے بہت دور چین سے سو رہے ہیں۔

سعید ۔۔۔ اچھا تو تم نے میرے تمام افسانوں کا مطالعہ کیا ہے! بتاؤ میری کتاب "فلسفۂ حیات" کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے۔

اجنبی ۔۔۔ ہر اعتبار سے کامیاب ہے۔ کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ آج روپیہ کی طمع نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں

قتال وجدال برپا کردیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کو جانے دو جنگ عظیم پر نظر ڈالو بجز اس کے اور کونسا جذبہ کارفرما تھا ہر قوی ملک کمزور کو صرف اس لئے غلام بنانے کی فکر میں ہے کہ اس کے لئے نیا بازار پیدا ہو جائے اور سرمایہ دار اپنی مشینوں کی پوری قوت وہاں کی دولت چھین لینے میں صرف کردے۔

سعید —— لیکن تمھیں معلوم نہیں مزدور بھی اب غافل نہیں ہیں۔ آہستہ آہستہ منظم ہوتے جارہے ہیں گو یہ رفتار بہت سست ہے۔ میں تمھیں سمجھاؤں گا کہ ان کی یہ تنظیم کسی کی سعی و کاوش کی مرہون منت نہیں بلکہ از خود ہوتی جارہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکثر مقابلہ کا جذبہ انھیں مغلوب کرکے اس اتحاد میں رخنہ پیدا کردیتا ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب ایک بین الاقوامی اتحاد مزدوروں میں رونما ہوکر سرمایہ داری کو ہمیشہ کے لئے فنا کردے گا۔ متوسط طبقہ بھی مزدوروں سے متحد ہوتا جارہا ہے اس لئے کہ ان کی معیار زندگی کا برقرار رہنا دوسری صورت میں ممکن نہیں ...... اچھا اب اس اجمال کی تفصیل ......

اجنبی —— خیر ہوگا میں ان فضول باتوں میں زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا کام کی بات کرو۔

سعید —— میں تمھیں کتنی کام کی بات بتا رہا تھا جس پر دنیا کی تمام آیندہ نسلوں کی حیات و موت کا انحصار ہے۔

اجنبی —— یہ باتیں میرے کس کام کی مجھے تو اس زمانہ کے مطابق چلنا ہے اور زندہ رہنے کے لئے جان پر کھیل کر روپئے حاصل کرنا۔ میرے یہاں آنے کی غرض تم سے افسانہ سننا نہیں ہے۔

سعید —— پھر کیا چاہتے ہو۔ ایں! تمھاری یہ داڑھی بھی مصنوعی معلوم ہو رہی ہے!!

اجنبی —— چاہتا کیا ہوں؟ یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آیا، انسانی دماغ کے بڑے بڑے راز تو جان لیتے ہو لیکن ایسی معمولی بات نہیں سمجھتے! میری داڑھی نقلی سہی کام تو اصلی کے برابر ہی دیتی ہے۔

سنو! اور کان کھولکر سنو!! میں جانتا ہوں کہ آج تم بنک سے ایک ہزار کے نوٹ برآمد کرکے لائے ہو۔ اسوقت سے برابر میں تمھیں تاکتا رہا ہوں، ابتک کمرہ سے باہر کہیں نہیں گئے بتاؤ کس بکس میں ہے۔ لاؤ کنجی لاؤ۔

یہ کہتے کہتے اجنبی نے پستول کی نالی اس کے سر سے لگادی۔

سعید —— (کچھ سوچکر) اچھا بیٹھ جاؤ میرے دوست جلدی کیا ہے۔ میں خود تمھارے حوالے کئے دیتا ہوں —— بکس کھولنے کی زحمت تمھیں کیوں دوں۔

اجنبی —— خبردار! اپنی جگہ سے اگر ذرا بھی حرکت کی تو میں تمھیں ہمیشہ کے لئے خاموش کردوں گا۔

سعید نے چپ چاپ کنجی کا گچھا اس کے حوالے کیا اور ایک بکس کی طرف اشارہ کیا۔ اجنبی آگے بڑھا سعید نے میز سے ٹیلیفون اٹھایا۔

اجنبی —— ہاہاہا ...... تم نے مجھے اسدرجہ بیوقوف سمجھ رکھا تھا۔ تمھارے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کردیا گیا ہے۔

تمھاری گھنٹی بیکار کردی گئی ہے۔ اور سنو یہاں سے بہت قریب ایک نہایت تیز رفتار موٹر کھڑا ہے اس لئے کہ جب میں تم سے رخصت ہوکر جانے لگوں اور کہیں تم پولیس کو خبردار کردو تو میں تم لوگوں کی دسترس سے جلد از جلد باہر ہوجاؤں۔

سعید ہکا بکا رہگیا۔ اجنبی نے بکس کھولا، اور بکس کو خالی دیکھ کر غصہ سے آنکھیں سرخ ہوگئیں۔

اجنبی — کیوں سعید! تم نے مجھے دھوکا دیا خیر چاہتے ہو تو اب بھی وقت ہے، مجھے بتاؤ کہ روپیہ کہاں ہے، صاف بتاؤ روپئے کہاں ہیں؟ (یہ کہکر وہ پستول کی لبلبی پر انگلی رکھدیتا ہے)

سعید — ٹھیرو! خدا کے لئے ایسا نہ کرنا ورنہ قوم اور اُس کے ساتھ خود تم میرے افسانوں سے محروم رہجاؤ گے روپئے میں خود تمھارے حوالہ کئے دیتا ہوں۔ لو یہ کنجی، اسی میز کی دراز میں روپئے موجود ہیں، جلدی سے نکال لو اور میرے دماغ کو کام کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دو۔

اجنبی — شاباش! اچھا ذرا تم اپنا ہاتھ تو اوپر اُٹھالو۔۔۔۔ اوپر۔۔۔۔ سر سے اوپر۔۔۔۔ بالکل سیدھا رکھو اور یاد رکھو اگر ذرا بھی حرکت کی تو۔۔۔۔

سعید نے ہاتھ اوپر اُٹھالیا اور کرسی سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

اجنبی داہنے ہاتھ سے میز کی دراز کھول رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے پستول سعید کی کنپٹی سے لگائے ہوئے تھا سعید میز کے نیچے نیچے آہستہ آہستہ پاؤں اُٹھا رہا تھا اور ٹھیک جسوقت اجنبی نے نوٹوں کے بنڈل پر ہاتھ ڈالا سعید نے تیزی سے پاؤں اُٹھا کر دراز پر ایک لات اس زور سے رسید کی کہ دراز جھٹکے سے بند ہوگئی اور اجنبی کا ہاتھ کچلکر رہگیا۔ درد سے بلبلا اُٹھا اور ہاتھ کھینچ کر کراہنے لگا۔ پستول بھی زمین پر گر پڑا تھا۔ سعید نے اُسے اُٹھالیا۔

سعید — میرے اچھے دوست "اب تمھیں یہاں ٹھہرنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ میں تمھارا شکرگزار ہوں کہ تم نے میرے افسانہ کو مکمل کرادیا۔

الیاس اسلام پوری

مجموعۂ استفسار وجواب جلد دوم

چھپ کر طیار نہیں ہوا ہے، اس لئے دوسری طیار شدہ کتابوں کے ساتھ اس کا آرڈر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جسوقت یہ مجموعہ شائع ہوگا، اس کی اطلاع ذریعہ نگار سب کو ہوجائیگی اور اسی وقت قیمت بھی اسکی ظاہر کردی جائے گی، فی الحال نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی ضخامت وقیمت کیا ہوگی۔

منیجر نگار

ہندوستان میں متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری

قبل اس کے کہ اس موضوع پر کوئی بحث کی جائے ہم یہ واضح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ متوسط تعلیم یافتہ طبقہ سے ہمارا کیا مفہوم ہے۔ "تعلیم یافتہ" اور "متوسط" ایسے الفاظ ہیں جو زبان زدِ عام ہیں لیکن ان کی منطقی تعریفیں مشکل سے کی جاسکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جاہل مزدور۔ جاہل ہوشیار ساہوکار اور جاہل خوشحال کسان پر لفظ "تعلیم یافتہ" کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح باحیثیت زمیندار۔ مالدار تاجر اور غریب کاشتکار متوسط نہیں کہے جاسکتے۔ لہذا "متوسط تعلیم یافتہ طبقہ" لوگوں کی وہ جماعت ہوئی جو نہ بہت امیر ہے نہ غریب اور جس نے ایک معیار معینہ تک تعلیم حاصل کی ہے۔

پس بے روزگاری کا تعلق ہمارے تمام بیکار تعلیم یافتہ نوجوانوں سے نہیں ہے بلکہ اس کا سروکار انھیں لوگوں سے ہے جو کہ مجبوراً بے روزگار ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ حضرات جن میں روزگار کی تلاش نہیں ہے بحث سے خارج ہیں۔

بے روزگاری کے خراب نتائج کے متعلق پروفیسر پیگو (Pigou) اپنی کتاب "بے روزگاری" میں رقم طراز ہیں کہ:۔

"مستقل کام کرنے کی عادت جاتی رہتی ہے اور جذبۂ خودداری و خود اعتمادی معدوم ہوجاتا ہے حتیٰ کہ اگر کام کرنے کا موقع بھی حاصل ہو تو وہ شخص جو کبھی بے روزگار تھا اب اس قابل نہیں رہتا کہ اس کو کسی کام سے لگایا جائے۔"

ہم دیکھ رہے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا ہے۔ رائج الوقت طریقۂ تعلیم بقول شخصے ہمیں کسی دفتر کی محرری کے علاوہ مشکل سے کسی اور کام کے قابل بناتا ہے۔ ملازمت نہایت اہم پیشہ تصور کی جاتی ہے۔ اس لئے ہمارا تعلیم یافتہ گروہ نوکری کی تلاش میں حیراں و سرگرداں پھرتا ہے۔ قانونِ قیمت کا اطلاق یہاں بھی ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ان کی مانگ سے زاید ہے لہذا ظاہر ہے کہ بازار میں ان کی قیمت ارزاں ہوگی۔ بعض اوقات لوگ مجبور ہوکر نہایت حقیر اور قلیل تنخواہیں قبول کر لیتے ہیں۔ مالکانِ کارخانہ صورتِ حالات سے فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور وہ بڑی تنخواہ کی اسامیوں پر ایسے لوگوں کا تقرر کرتے ہیں جو کم تنخواہ پر کام کرنیکے لئے رضامند ہوجاتے ہیں

باکار لوگوں کی جماعت میں یہ چیز خطرہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی جگہ پر کب کسی دوسرے آدمی کی تعیناتی ہو جائے گی تنخواہ کی قلت کا اتنا ڈر نہیں ہے جتنا کہ روزگار سے بے روزگار ہو جانے کا خدشہ ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں مسئلۂ بے روزگاری نے ایک نہایت اہم شکل اختیار کر لی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اور عوام دونوں کی توجہ اس جانب مبذول ہو گئی ہے۔ یہ ایک ایسی وبا ہے جس میں تمام ہندوستان مبتلا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری بڑھتی ہی گئی۔ دوران جنگ میں معیار معاشرت بلند ہو گیا اور اس کے اختتام کے بعد بھی بلند رہا۔ صوبہ جاتی اور مرکزی حکومتوں اور بعض نیم سرکاری مجلسوں نے اس مسئلہ میں کافی دلچسپی لی۔ اور طبقہ متذکرہ بالا کی بے روزگاری کے اسباب دریافت کرنے کے لئے مختلف صوبوں اور ریاست ٹراونکور میں وقتاً فوقتاً مختلف تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔

اگر ہم ان صوبجاتی کمیٹیوں کی رپورٹوں کا اجمالی طور پر مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مسئلۂ بے روزگاری کا تعلق کسی خاص صوبہ سے نہیں بلکہ تمام ہندوستان سے ہے۔ مدراس کمیٹی کی رائے میں ہر تین طلبہ میں جو اسکولوں اور کالجوں سے باہر نکلتے ہیں دو نوکری کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور دوسری تحقیق کی بموجب سو فیصدی نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

پنجاب کمیٹی (سنہ ۱۹۲۷ء) بھی اسی نتیجہ پر پہونچی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی پیداوار پانچ سال کے زمانہ میں (سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۷ء) دونی سے زائد ہو گئی ہے۔ لیکن روزگار میں اس کے تناسب سے بہت قلیل فرق واقع ہوا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر کہیں کوئی جگہ خالی ہوئی تو ہزاروں کی تعداد میں درخواستیں گزرتی ہیں۔ حال کا واقعہ ہے کہ رزرو بینک آف انڈیا (Reserve Bank of India) نے ۸۰ محرروں کے لئے ساٹھ روپیہ کے مشاہرہ پر اشتہار دیا اور دس ہزار درخواستیں موصول ہوئیں۔

مندرجہ بالا مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کس قدر بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے اور ملازمت کس قدر عنقا ہو رہی ہے۔

بمبئی کمیٹی کی رائے میں نوجوانوں کی کثیر تعداد بے روزگار ہے اور تعلیم یافتہ گروہ میں جن کی عمریں ستائیس (۲۷) سال سے کم ہیں بہت زیادہ لوگ بیکار ہیں۔ حالانکہ بے روزگاری کا سلسلہ ۴۲ سال کی عمر تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ نوجوان جو انٹرنس یا اس کے برابر کا امتحان پاس کرنے سے قاصر رہے ہیں ان میں بے روزگاری بدرجہ اتم ہے کیونکہ سرکاری ملازمت کے واسطے انٹرنس یا اس کے برابر کا امتحان پاس کرنا نہایت ضروری ہے۔ انڈر گریجویٹ اور گریجوئیٹ میں انٹرنس والوں کی بہ نسبت بے روزگاری کم ہے۔ وکالت کے پیشہ میں اب کچھ نہیں رہا کتنے وکیل ایسے ہیں جو کچہریوں میں جاتے ہیں، دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور شام کو انھیں یکہ کا کرایہ بھی میسر نہیں آتا۔

جن لوگوں نے کوئی پیشہ سیکھ لیا ہے ان کی حالت ادبی تعلیمیافتہ لوگوں کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ بے روزگاری روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے خواہ اعلیٰ تعلیم یافتہ گروہ کو لیجئے یا ادنےٰ تعلیم یافتہ جماعت کو۔

صوبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی حکومت نے بھی حال ہی میں اس مسئلہ کے حل کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی بصدارت رائٹ آنریبل جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو مقرر کی ہے جسکی رپورٹ عنقریب شایع ہونے والی ہے۔ تعلیم یافتہ گروہ کی اس قدر وسیع بے روزگاری خالی از خطرہ نہیں۔ اور حکومت کو سمجھنا چاہئے کہ اگر وہ اس بے روزگاری کے انسداد کا معقول انتظام نہیں کر سکتی تو بہت جلد اُس کو ایک نہایت اہم مسئلہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ابھی تک تو گورنمنٹ کمیشن مقرر کرکے اس مسئلہ کو ٹالدیا کرتی تھی لیکن اب یہ چال کام نہ دیگی لوگ حقیقت سے آشنا ہو چلے ہیں۔ تاریکی کا پردہ ان کی آنکھوں سے اُٹھ گیا ہے۔ لہذا آنے والے خطرہ کا انسداد شطرنج کی ان چالوں سے نہیں ہو سکتا۔ اشتراکیت اور جماعت بندی کی روح ہر ہندوستانی تعلیم یافتہ کی رگ و خون میں پیوست ہوتی جا رہی ہے اور بہت جلد ان کے جمود و سکون میں انقلاب پیدا ہونے والا ہے۔ اس جذبہ کا پیدا ہونا کچھ ہندوستان ہی کے لئے مختص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ جہاں بے روزگاروں کی نگہداشت نہیں کیجاتی ان کو کام پر نہیں لگایا جاتا یہی صورت پیدا ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے، بیکار کا دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں تمام ہندوستانی یونیورسٹیوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اُنھوں نے بے روزگاری کے مسئلہ پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی اور آخر میں۔ یہ قرار پایا کہ ہر یونیورسٹی اپنی پیداوار کی بے روزگاری کے اعداد و شمار فراہم کرے۔

حکومت ہند بھی اس مسئلہ کی اہمیت سے غافل نہیں ہے سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ایک اور خانہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں ۲۰ سال کی عمر سے لیکر ۴۰ سال کی عمر تک کے تعلیم یافتہ بے روزگار لوگوں کا اندراج کیا جائیگا تاکہ بے روزگاروں کی تعداد معلوم ہوتی رہے اور اُن کو کام پر لگائے جانے کی سبیل نکالی جائے۔

بے روزگاری کے اسباب

یوں تو تھوڑی بہت بے روزگاری پہلے بھی تھی لیکن جنگ عظیم نے پڑھے لکھے لوگوں کی بے کاری میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے، جنگ کے اختتام پر بہت سے لوگوں کو اپنی ملازمتوں سے مجبوراً مستعفی ہونا پڑا کیونکہ اب ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں تھی۔ اسلئے بہت سے محرر جو کہ دوران جنگ میں مختلف دفتروں میں نوکر تھے لڑائی کے ختم ہونے پر بیکار ہو گئے۔ جنگی اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے بہت سے محکموں میں تخفیف ہونی شروع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ جو برسرکار تھے آج بیکار نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو جن کی تعداد دسمبر کے

مد کی طرح بڑھ رہی ہے اور جن کی نوکریاں اس کے جزر کی طرح گھٹ رہی ہیں ملازمت مشکل سے میسر آسکتی ہے
موجودہ ناقص طریقۂ تعلیم بھی بے روزگاری کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے، موجودہ تعلیم جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہے صرف ادبی حیثیت رکھتی ہے، حالانکہ ہم کو نہ ورڈس ورتھ کی نیچرل شاعری کی ضرورت ہے اور نہ شیلے کے پرواز تخئیل کی۔ ہمارے لئے یہ چیزیں بیکار ہیں۔ یہ مشغلہ کسی خوشحال ملک کے باشندوں کا ہونا چاہئے جو اطمینان سے کھاتے ہیں اور آرام کی نیند سوتے ہیں۔ ملک بہانگ دہل پکار رہا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو فنی تعلیم کی ضرورت ہے اور اسی میں ہندوستان کے فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ ملک میں جو چند درسگاہیں ایسی ہیں بھی تو وہ ہندوستان کے مناسب حال نہیں۔ کیونکہ ان مدارس کے طلبہ اس قابل نہیں ہوتے کہ پیشہ ور لوگوں کی طرح فوراً کام پر لگائے جاسکیں۔
اس سلسلہ میں فنی درسگاہوں کے عیوب اور اُن کی ناکامیابی کے اسباب کا تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان درسگاہوں کی تعلیم میں نقص یہ ہے کہ عملی زندگی کا خاکہ پیش نظر نہیں ہوتا بلکہ نظریوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ جب طلبہ ایسے اسکولوں سے پاس ہو کر نکلتے ہیں تو وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ پیشہ ور کارگیروں کی طرح کام کر سکیں۔ فنی مدارس کی ناکامیابی کا سبب اچھے کارخانوں کی عدم موجودگی بھی ہے طلبہ اسکول سے سند لیکر ملازمت کی جستجو کرتے ہیں لیکن کارخانوں کی کمی کے باعث ناامید ہو کر بیٹھ رہتے ہیں اسکا اثر صرف اُنھیں طلبہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسرے بچے بھی اس سے متاثر ہو کر ایسے اسکولوں کی جانب رخ نہیں کرتے۔ تلاش معاش کی مایوسیوں سے خود اعتمادی جاتی رہتی ہے اور یہی لڑکے ان مدارس سے متنفر ہو کر ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں۔
ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے ملازمت کو ایک نہایت ہی معزز پیشہ بلکہ یوں کہئے کہ ایک خاص امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ لہذا سب سے ضروری چیز لوگوں کو اس ذہنی غلامی سے آزاد کرانا ہے جب تک کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ کی غلامانہ ذہنیت نہ بدلے گی بے روزگاری کا تدارک بہت ہی مشکل ہے۔ ڈارلنگ صاحب فرماتے ہیں کہ " ہندوستانی تعلیم یافتہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں اپنی ذلت سمجھتا ہے" اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں۔
تعلیم یافتہ گروہ کی بے روزگاری کا ایک اور سبب ہماری معاشری زندگی سے متعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افتراق ذات، اوائل عمر کی شادی، ہندوستانی کی اپنے خاندان سے غیر معمولی محبت اور یکجائی بود و باش ایسی چیزیں ہیں جو ہمیں بے روزگار پڑے رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر خاندان کی یکجائی بود و باش کو لیجئے کہ جہاں یہ بعض حیثیتوں سے مفید ہے وہیں اپنے ساتھ برائی کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے

اس یکجائی بود و باش ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم روزی حاصل کرنیکے واسطے ہاتھ پاؤں نہیں چلاتے اور اس سے انفرادی خودمختارانہ جذبہ کا خون ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے والدین اور سرپرستوں کی زندگی میں مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھتے ہیں اور اُن کے مرنے کے بعد ہمیں ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ الاماں۔۔

اس کے بعد اوائل عمر کی شادی کو لیجئے جو ہماری شاہراہ عمل میں بڑا روک ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ رسم زندگی کے پہلے ہی دور میں ہمیں خاندانی ذمہ داریوں کا حامل بنا دیتی ہے۔

اسی کے ساتھ آبادی کے مسئلہ کو بھی لیجئے۔ ہندوستان کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے اور بے روزگاروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے اعداد مردم شماری کا مطالعہ کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ ملک کی آبادی ۳۵ کرور سے زاید ہے اگران اعداد کا گزشتہ (۱۹۲۱ء) کے اعداد مردم شماری سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آبادی میں کم و بیش تین کروڑ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اگران اعداد کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیا جاوے تو ایک عجیب بات کا انکشاف ہوگا اور وہ یہ کہ متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی آبادی گزشتہ دس سال میں (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۱ء) بہت بڑھ گئی ہے بچپن کی شادی اور شباب کی نادان اُمنگوں کا نتیجہ اضافۂ آبادی ہے۔

بیچارے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان کی حالت بہت دردناک ہے۔ بیوی کے طعنے، خاندان والوں کی زجر و توبیخ عزیز و اقارب کی بے توجہی کوئی کب تک سہے۔ انسان آخر کار خوددار ہے۔ اسکی غیرت جوش میں آتی ہے۔ اور وہ ایسے بہیمانہ کام کر بیٹھتا ہے کہ روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اور اس بلا کے شکار ہوکر متعدد تعلیم یافتہ نوجوان خودکشی کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ روزانہ آپ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔

آبادی کے بڑھتے ہوئے دھارے کی روک بھتام ضبطِ تولید سے کیجا سکتی ہے۔ ہرچند اس سے مسئلہ بے روزگاری حل نہیں ہوتا تاہم بے روزگاروں کی تعداد میں آیندہ اضافہ کا ہونا رک جائے گا۔

بے روزگاری کا تدارک

ہرچند بے روزگاری کا حل نہایت دقت طلب مسئلہ ہے لیکن اگر عوام اور حکومت کی توجہ نیک نیتی کے ساتھ اس جانب مبذول ہو جائے تو اس کا تدارک کچھ مشکل نہیں ہے۔ جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی جو حالت تھی وہ سب پر ظاہر ہے ۱۹۱۸ء میں جرمنی بربادیوں کا نہایت ہولناک منظر تھا، قوم بھوک سے مر رہی تھی اور جنگی قرض حکومت کو پیسے ڈالتا تھا۔ تنخواہوں میں شدید تخفیف ہو گئی تھی۔ ملک کے تاجروں اور کارخانوں کے مالکوں کا دیوالہ نکل گیا تھا اور مصیبت زدہ رعایا کی گردن پر ٹیکس کی ادائیگی کا بار حد سے زیادہ تھا۔ لیکن ریپبلک حکومت کے برسر اقتدار ہوتے ہی ترقی نمودار ہوئی اور ایک مرتبہ پھر جرمنی کے تاخت و تاراج، خزاں رسیدہ گلشنِ صنعت و حرفت میں بہار آئی واضح رہے کہ مغربی ممالک

میں سب سے زیادہ گنجان آبادی جرمنی کی ہے۔ ایک مربع کیلومیٹر میں ۴۳۱۱ آدمی آباد ہیں۔ برخلاف اسکے روس فرانس اور انگلستان میں (بہ شمول نوآبادیات) ۷،۸،۴،۱ - آدمی فی مربع کیلومیٹر آباد ہے۔ جرمنی کے لوگ کہیں ہجرت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ جرمنی کا مشرقی غیر آباد حصہ ورسلیز کی صلح کے بموجب پولینڈ کو دیدیا گیا تھا۔ دوران جنگ میں جرمنی سے اسکی نوآبادیات چھن گئی تھیں۔ ایسی صورت میں جرمنی کی پریشانیوں کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔

اگرچہ موضوع بحث ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری تھا لیکن جرمنی کی بے روزگاری کا قصہ درمیان میں مصلحتاً شامل کیا گیا ہے کہ شاید کوئی راہِ عمل ایسی نکل آئے جس سے ہندوستان کی بیروزگاری کا تدارک ہو سکے۔

یوں تو بے روزگاری کا مسئلہ آجکل تمام دنیا میں عام ہو رہا ہے اور مختلف حکومتیں اس کی تخفیف کی کی کوشش بھی کر رہی ہیں لیکن نازی حکومت نے اس کام کو جس خوبی کے ساتھ انجام دیا وہ قابل ستائش ہے۔

ہر ہٹلر نے بے روزگاروں کی کھپت کے واسطے حکومت کی جانب سے رفاہ عام کے کام شروع کئے۔ حکومت نے اپنے سرمایہ سے امداد دیکر شخصی کارخانوں کو فروغ دیا اور اس طریقہ سے بے روزگاروں کی ایک اچھی خاصی جماعت کو ان کارخانوں میں کام مل گیا۔ جب سے تجارت میں انحطاط شروع ہوا ہے لوگوں میں بے روزگاری پھر پھیلنے لگی ہے۔ لیکن نازی حکومت نے اس کا بندوبست یہ کیا ہے کہ کارخانے سے بڑھے ہوئے آدمیوں کو زراعت پر لگا دیتی ہے۔ اور اس طرح بے روزگاری کے پھیلنے کا اندیشہ جاتا رہا۔

حکومتِ ہند جنگ عظیم کے بعد سے جرمنی کی طرح خستہ حال نہیں ہے اور ہر طور پر مستحکم ہے۔ گورنمنٹ کو اگر ملک کے باشندوں کے ساتھ ہمدردی ہے تو وہ اُن کے مفاد کے لئے سب کچھ کر سکتی ہے۔ خلوص نیت اور قوتِ ارادی کی ضرورت ہے۔ ملک کے اندر ریل اور پختہ سڑکوں کی بہت کمی ہے۔ اس زمانہ میں بھی آپ کو ایسے مقامات ملیں گے جو ریل اور پختہ سڑکوں سے پچاس پچاس میلوں کی دوری پر واقع ہیں۔ اور ان مقامات تک پہونچنے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں چالیس ہزار میل ریل کی پٹڑیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ لہذا اگر ریل اور سڑکوں کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے تو ہمارے بہت سے بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دورانِ تعمیر میں محرروں اور منشیوں کی ضرورت ہوگی اور جب ریلیں بنکر تیار ہو جائیں گی تو اسوقت اسٹیشن ماسٹر۔ کلرک۔ تار محرر۔ اور گارڈوں کی ضرورت ہوگی اور بے روزگاروں کی کافی تعداد کو کام مل جائے گا۔

اسی طرح مرکزی حکومت اور بہت سے رفاہ عام کے کام کر سکتی ہے مثلاً خشک اور غیر آباد حصوں میں نہروں کی تعمیر ہو سکتی ہے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نوآبادی بسائی جا سکتی ہے۔ حکومت اپنے سرمایہ سے

ملک کے اندر بڑے بڑے کارخانے کھول سکتی ہے اور اس میں بہت سے لوگوں کی کھپت ہو سکتی ہے ساتھ ہی ساتھ حکومت یہ بھی کر سکتی ہے کہ ملک کے ہونہار نوجوانوں کو وظائف دیکر غیر ممالک میں فنی تعلیم کی تکمیل کے واسطے بھیجے اور جب وہ وہاں سے واپس آویں تو ملک کے اندر فنی مدارس قایم کرے تاکہ باہنر لوگوں کی کمی کارخانوں میں نہ محسوس کیجائے۔ اور ہندوستان کی صنعت و حرفت آسانی کے ساتھ ترقی کرتی رہے۔

ہندوستانی سرمایہ عروس نو کی طرح "شرمیلا" کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی سرمایہ دار اپنی رقم کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سرمایہ کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں ہے اگر حکومت سرمایہ داروں کو اطمینان و ہمت دلائے اور اُن کے سرمایہ کی حفاظت کا ذمہ لے تو ملک میں خارجی سرمایہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اندرونی سرمایہ سے جو کارخانے کھولے جائیں گے۔ ان کے اندر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ٹریننگ کا انتظام بحیثیت اُمیدوار نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ خارجی سرمایہ کے جتنے کارخانے ہیں ان میں اُمیدواروں کو کام سکھلانے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اور ان کارخانوں کو دیسی امیدواروں کے ساتھ کوئی ہمدردی بھی نہیں ہوتی — حکومت اگر ایسے قوانین وضع کردے کہ یہ کارخانے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مقررہ تعداد کو ہر سال کام سکھائیں تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا اور بے روزگاری بھی ایک حد تک کم ہو جائے گی۔

بے روزگاری کی تخفیف کے واسطے ایک اور تجویز پیش کی جاتی ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کاشتکاری کی طرف راغب کیا جائے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ طریق کار بالکل بے سود ثابت ہوگا کیونکہ ہندوستان کی آبادی کا ۹/۱۰ حصہ فی الحال کاشتکاری کر رہا ہے اور زمین پر آبادی کا بوجھ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ زراعت سے ہٹا کر لوگوں کو دوسرے کاموں پر لگایا جائے نہ کہ اسی پیشہ میں ملک کی بقیہ دس فیصدی آبادی کا بار بھی اس پر ڈال دیا جائے علاوہ بریں اس میں اور نقصانات کا بھی اندیشہ ہے مثلاً :-

۱ — اس تجویز پر عمل کرنے سے ان لوگوں میں بے روزگاری پھیلنے کا اندیشہ ہے جو پہلے سے کاشتکاری میں لگے ہوئے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ اگر ایک جماعت بارروزگار ہو جاتی ہے تو دوسری جماعت بے روزگار ہو جائیگی اور یہ بے روزگاری کا کوئی حل نہ ہوگا۔

۲ — اگر فرض کر لیا جائے کہ تعلیم یافتہ بے روزگار طبقہ زراعت پیشہ بننے میں کامیاب ہو جائے گا تو ایسی صورت میں غریب کاشتکار طبقہ بڑی مشکل میں پھنس جائے گا۔ کیونکہ تعلیم یافتہ اشخاص کے مقابلہ

میں بیچارہ جاہل کسان نہیں ٹھہر سکتا ہے ۔ الغرض اسوقت بے روزگاری کا مسئلہ ملک کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور ضرورت کہ سب سے پہلے اس طرف توجہ کی جائے ، لیکن افسوس ہے کہ نہ حکومت اس پر سنجیدگی سے غور کرتی ہے اور نہ ہمارے قومی ادارے کوئی پروگرام ایسا پیش کر سکتے ہیں جو صحیح معنے میں اس درد کا علاج ہو سکے ۔

بشیر احمد خاں بی اے (علیگ)

مجموعۂ استفسار و جواب

جلد اول

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی ایک جلد ہے جس کے ۵۱۲ صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے اس جلد میں تقریباً ۲۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملیگا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا ، چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو :—

مسئلۂ جبر و اختیار — خواب کی حقیقت ۔ معاد و خلود ۔ طبقۂ نسواں اور غزلگوئی — برج بابل ۔ فاسسٹ جماعت ۔ سامری کون تھا ۔ باغ ارم کی حقیقت ۔ فلسفۂ محبت ۔ بھوت پریت ۔ اصحاب کہف — سالویشن آرمی ۔ ہالہ کا سبب ۔ معجزہ و کرامات — فرقۂ معتزلہ ۔ مذہب و عقل ۔ طوفان نوح ۔ یاجوج و ماجوج ۔ برہمو سماج ۔ طبقۂ نسواں اور تعلیم — مریخ کی حقیقت — منصور حلاج ۔ چند الفاظ کی تحقیق — اصطلاحات تصوف کا ترجمہ ۔

قیمت مع محصول خریداران نگار سے ۲؍۸ غیر خریداران سے ۳ روپے

منیجر نگار لکھنؤ

اردو میں بالکل نئی اور پہلی کتاب

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

اس میں تاریخی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے فواحش و عصیاں نگاری پر عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک ایک بسیط تبصرہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کن کن قوموں میں کس وقت تک کیسی کیسی فحاشیاں رائج ہوئیں اور اخلاق انسانی پر اسکا کیا اثر پڑا ۔ یہ کتاب نہایت نادر معلومات اور عجیب و غریب واقعات تاریخی کا مجموعہ ہے ۔ اور اس موضوع پر اسوقت تک کوئی کتاب اردو میں پیش نہیں کی گئی — اسمیں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہوتا ہے ۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنیکے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے ۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں کہ آپنے کبھی نہ سنے ہونگے ۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۲؍ کے مجلد کتاب صرف ۲؍ میں ۔ اور غیر مجلد ۱؍۸ میں ملیگی ۔ اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۳ روپے میں اور غیر مجلد ۲ روپے میں علاوہ محصول ۲؍ کے ملے گی ۔ اگر ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی پی روانہ کی جائے — منیجر نگار لکھنؤ

بعض تاریخی کسبیوں کے خطوط

دوسری صدی عیسوی میں السفران، یونان کا مشہور انشاپرداز تھا اور اس کی انشاپردازی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ فرضی خطوط کے ذریعہ سے کردار نویسی کیا کرتا تھا اس کے ایک خط کا ترجمہ ناظرین نگار کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ نیاز

تھائیس کا خط یوتھائی ڈیمس کے نام ـــــ

جب سے تم نے فلسفہ پڑھنا شروع کیا ہے، تمہاری حالت ہی عجیب ہوگئی ہے۔ یتوریاں چڑھی ہوئی بھویں تنی ہوئی، گویا جینا وبال ہے! جس وقت تم عبا پہنے، ہاتھ میں کتاب لئے اکاڈمی جاتے ہو تو تم میرے گھر سے اس طرح گزر جاتے ہو گویا مجھ سے واقف ہی نہیں، کبھی اس گھر میں قدم رکھا ہی نہیں۔

یوتھائی ڈیمس تم پاگل ہو اور مطلق واقف نہیں کہ یہ تمہارا پروفیسر جو یقیناً تم سے عجیب وغریب باتیں کرتا ہوگا کیا چیز ہے ـــــ مجھ سے سنو۔

ایک زمانہ سے یہ کمبخت مجھ سے ملنے کی التجائیں کر رہا تھا لیکن میں نے ہمیشہ اس کی دولت کو تم پر قربان کر دیا اور اب وہ میگارا کی نوجوان کنیز پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ لیکن چونکہ اب تم اس کے زیر اثر مجھ سے دور دور رہنا چاہتے ہو، میں اس کی التجا قبول کر لوں گی اور اگر تم پسند کرو تو یہ بھی ثابت کر دوں گی کہ وہ لذتِ یک شب سے زیادہ کچھ اور بھی مجھ سے چاہتا ہے۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک پروفیسر، کسبی سے مختلف کوئی چیز ہے۔ طریقے میں اختلاف ہو تو ہو، لیکن مدعا دونوں کا وہی ایک ہے ـــ دولت سمیٹنا۔ اور سچ پوچھو تو ہم کسبیاں اس سے بہتر ہیں کہ ہمارے دلوں میں خدا کا ڈر تو ہے، ہمارے چاہنے والے جب قسم کھا کر اپنی وفا کا یقین دلاتے ہیں تو ہم اسے باور کر لیتے ہیں ـــ بیشک ہمیں یہ نہیں معلوم کہ بادل کیونکر بنتے ہیں، جوہر و دقائق کی کیا حقیقت ہے، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے اس کا علم اور ہمارا جہل دونوں برابر ہیں۔

میں نے بارہا ایسے لوگوں سے باتیں کی ہیں، گھنٹوں ان کی صحبت میں صرف کئے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ہمارے پاس ہوتے ہیں تو دس بجے صبح سے پہلے ان کی آنکھ نہیں کھلتی اور بغیر شراب کے نوالہ نہیں توڑتے۔

میرے پیارے، یہ برہمی چھوڑ دو۔ ایسی خوبصورت آنکھوں میں جیسی تمہاری ہیں غصہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آجاؤ، کسی دن اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے آجاؤ، پہلے ایک دو شیشے شراب کے خالی کریں گے اور پھر دونوں ملکر سوچیں گے کہ زندگی کا مقصود کیا ہے۔

زمانہ زیادہ جینے کی بھی مہلت نہیں دیتا، لذت و مسرت کیسی، اس لئے مہلات میں بیکار وقت نہ ضایع کرو، میرے پاس آؤ، کام کی باتیں کریں۔

اطلاعنامہ بنام دایناں دربارہ ادخال درخواست بریت

(دفعہ ۱۴(۱) ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب بابو شیو گوپال صاحب ماتھر جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۳ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی بلاقی ولد پتو قوم خاکروب ساکن مصطفےٰ منزل فراشخانہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ

بنام { گوپال ولد جے نرائن گنگا دھر ولد رامداس اقوام رستوگی ساکنان رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
بلدیو داس ولد لچھمن داس قوم رستوگی ساکن بیگم گنج تھانہ چوک شہر لکھنؤ لالہ متھرا و سندر لال اقوام رستوگی ساکنان
باغ مکا تھانہ چوک لکھنؤ، سندر لال قوم بقال ساکن شیوالہ بھوانا سنگھ محلہ ٹاٹ پٹی تھانہ چوک لکھنؤ و
منموہن قوم رستوگی ساکن بازار کھالہ تھانہ چوک لکھنؤ }

مطلع ہو کہ دیوالیہ مذکور الصدر نے اپنی بریت کی درخواست عدالت ہذا میں گزرانی ہے اور عدالت ہذا نے سماعت درخواست کے واسطے تاریخ پانچ ۵ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء بوقت دس ۱۰ بجے دن مقرر کی ہے۔

تاریخ ۲ ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۵ء۔

بحکم عدالت

بشمبر دیال منصرم
عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

محسن کاکوروی

پیدائش ۱۸۲۳ء ــــــ وفات ۱۹۰۵ء

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسن
کلامِ نعتیہ رکھا میری زباں کے لئے

لکھنؤ کی خوشامدانہ شاعری کا دورِ ناسخ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جس نے دُنیائے ادب میں اگر مرثیہ نگاری کے بعد کوئی قابلِ ذکر، دیرپا کارنامہ پیش کیا ہے تو وہ یقیناً صوفیانہ شاعری اور نعت گوئی ہے۔ جس کو حضرت غوث ملت شاہ تراب علی قلندرؒ، مولانا غلام امام شہیدؒ، مولانا امیر احمد امیر مینائیؒ، اور حسان الہند علامہ مُحسن سے تعبیر کرنا کچھ بیجا نہیں ہے یہ واقعہ ہے کہ اگر غزل گوئی میں میرؔ، صوفیانہ شاعری میں شاہ تراب علی اور مرثیہ نگاری میں میر انیسؔ کا مقابل اور مماثل دارالسلطنت دہلی پیدا نہ کرسکا تو حضرت مُحسنؔ کی نعت گوئی کا بھی جواب آج تک نہ ہوسکا۔ اساتذۂ دہلی نے تو خیر اس صنفِ سخن میں دلچسپی ہی نہ لی البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اساتذۂ لکھنؤ نے ضرور اس صنف کو قابلِ اعتنا خیال کیا جو بعد میں شاہانہ زرپاشیوں کی بدولت منقبت نگاری میں تبدیل ہوگئی۔

حضرت مُحسنؔ خالص لکھنوی تھے۔ انھوں نے وطنی جوش میں عجم پرستی کی کورانہ تقلید کے ذہنی خطِ غلامی کے خلاف علی الاعلان پرچمِ بغاوت بلند کیا بلبلوں کی نغمہ سرائی اور طائف کی شبِ ماہ کی جگہ برسات کے جگنو اور ہندوستان کے کالے بھونروں کی موسیقی سے کام لیا۔ کنہیا جی اور گوپیوں کی عارفانہ داستانِ عشق لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد کی فرسودہ اور پامال تمثیلات کو افسانۂ کہن بنادیا۔ اور تموج اور گنگا کی طغیانی سے جیحون اور سیحون کو گونگے کا خواب ثابت کردکھایا۔

یہی وہ ذہنی انقلاب تھا کہ محسن نے ایک انداز خاص سے اپنے خالص مذہبی قصیدے میں انوکھی وطنی تشبیب

استعمال کرکے ہمیشہ کے لئے ایک طرف تو ہندو مسلم اتحاد کا بنیادی پتھر رکھا اور دوسری جانب ان بے نظیر تلمیحات سے اپنے کلمہ گو بھائیوں کے کانوں کو آشنا کر دیا۔ اور واقفین رموز پر آشکارا ہو گیا کہ محسن بحیثیت وطنی شاعر کے اپنی صنف خاص میں یکتا و فرد ہیں۔

حضرت محسن نے دور مغلیہ کے آخری عہد میں آنکھیں کھولیں۔ برطانوی اقتدار کی بڑھتی ہوئی تیز اقبالی شعاعوں کو فردا کے آئینہ میں دیکھا۔ یادش بخیر اودھ کے شباب کی رنگینیوں اور سرمستیوں کا بھی مطالعہ کیا اور اس سے بھی بڑھکر ہنگامہ مشرق کے خون آشام افسانوں کو بنظر تعمق دیکھا لیکن تعجب انگیز امر تو یہ ہے کہ محسن نے خود ان دھوپ چھاؤں کی کائنات سے ماورا اپنے لئے جو ماحول وضع کیا وہ بالکل انوکھا اور جداگانہ تھا۔ اُن کے اجداد آستانۂ رسول اللہ و ارض مقدس سے جدا ہو کر قصبۂ صحرام توابع حوات میں جو بغداد و ممالک خراسان کے وسط میں واقع ہے آباد تھے۔ قاری محمد صدیق اس خاندان کے اول فرد ہیں جو ہندوستان تشریف لائے۔

مولانا حسین شہید جن کے سایۂ عاطفت میں جناب محسن نے زانوئے ادب تہ کیا اپنے والد ماجد حضرت شاہ میر محمد قلندر کے مرید اور صاحب ارشاد و اجازت تھے۔ عین حالت نماز میں ایک ظالم کے ہاتھوں انھوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اور بہ برکت اسم مبارک حضرت شہید کربلا حیات جاوید پائی اور

سر دشمن بریدہ گشت تراب　　　　حال رحلت شہید اکبر گشت

سے حضرت غوث ملت شاہ تراب علی قلندر نے تاریخ شہادت نکالی۔

حضرت محسن کے والد ماجد مولانا حسن مرحوم صاحب تفریح الاذکیا فی احوال الانبیا بہت بابرکت بزرگ اور عالم متبحر تھے۔ وہ دو با اقبال صاحبزادوں مولوی محمد محسن اور مولوی محمد احسن کو خوش و خرم اور با اقبال چھوڑ کر ۱۹ جمادی الاول ۱۳۰۱ھ کو رحلت فرما گئے۔

غرض اس متبرک اور قابل تقلید فضا میں حضرت محسن نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت محسن کے کلام پر ان حالات کا بہت گہرا داخلی اور خارجی اثر پڑا اور جب جناب محسن کو اپنے جذبات دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ اُسی سلسلۃ الذہب کی شاہراہ پر چلنے کے لئے مجبور ہوئے اور دنیا کو بھی مذہب کی بھولی بسری ہوئی داستانیں سنائیں۔

جناب محسن کی ولادت ۱۲۴۲ھ بمقام قصبۂ کاکوری ہوئی نظر محمد اور منظور الٰہی تاریخی نام تھے۔ سات سال کے سن سے اپنے جد امجد حضرت حسین شہید کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ اُن کی ابتدائی تعلیم جس طرز

سے ہوئی اس کا اقتضا یہی تھا اور دانشمندان کہن سال کا تجربہ بھی پیشین گوئی کر چکا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر صاحبِ کمال ہوگا۔ تین چار بجے رات سے اُٹھکر نماز تہجد پڑھتے اور تلاوت کلام پاک کے بعد درود شریف اور دیگر وظایف خاندانی میں مشغول رہتے تھے۔ مذہبی عقیدت اور نبی کی محبت رگ رگ میں سرایت کرتی جاتی تھی عمر کے متجاوز ہوتے ہی شب بیداری اور یاد حق کی عادت محمود نے طبیعت ثانیہ بنکر تمام عمر اُن کا ساتھ دیا۔

جناب محسن کا نشو و نما اپنے والد حضرت ابوالمحسن حسن کے ساتھ مین پوری میں ہوا۔ کتب درسیہ کا اتمام مولوی عبدالرحیم اور اپنے باکمال پدر نامدار سے کیا۔ شاعری میں مولانا ہادی علی اشک مرحوم سے مشورہ کرتے تھے اور بیعت اپنے جد امجد سے تھی۔

۱۹۰۵ء اپریل کی پانچویں تاریخ پیام مصیبت لائی یعنی حضرت محسن اسہال کبد کے مہلک مرض میں مبتلا ہوئے۔ اشتہا بالکل جاتی رہی۔ علاج و معالجہ سے کوئی افاقہ نہ ہوا اور طبیعت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ۲۳ اپریل ۱۹۰۵ء روز یکشنبہ کو بعد نماز ظہر ارشاد فرمایا کہ اب ہمارا آخری وقت ہے تجہیز و تکفین کی تیاری کرو کل کوچ ہے۔ اپنے بڑے صاحبزادے سے در مختار نکلوا کر باب الشہید سنا۔ شب کو مرض میں اشتداد ہوا اور بروز دوشنبہ بتاریخ ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو علی الصباح ارشاد فرمایا کہ اب ہمارا کوچ ہے یہ کہکر یاد حق میں مشغول ہو گئے پاس انفاس جاری تھا۔ حالت تلقین میں ہر بار بطابق تشہد اشہد پر انگشت شہادت اُٹھاتے تھے اسی حالت میں دس بجے دن کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور صحن عیدگاہ مین پوری میں اپنی وقف کردہ زمین میں دفن کئے گئے۔

مولانا فرجاد نے کلام پاک کی ایک آیتہ سے مادہ تاریخ نکالا۔ اور ایک تاریخ انکے بڑے صاحبزادے علامہ نور الحسن نیر صاحب نور اللغات نے فارسی میں لکھی جو کتبے پر کندہ ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اُردو کی نشو و نما سے قبل ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ادبی مذاق فارسی تھا۔ عدالت کی زبان فارسی تھی۔ مراسلت فارسی میں بعد کو ہوئی تھی۔ شعر کا مذاق فارسی تھا۔ حتیٰ کہ داد سخن کے طریقے بھی خالص ایرانی تھے کھانے عجمی تھے۔ لباس عجمی تھے۔ اور معاشرت میں بھی ایرانی رنگ کا اثر موجود تھا۔ چنانچہ جناب محسن نے بھی اسی فضا میں آنکھیں کھولیں اور ابتدائی شاعری میں ان کے یہاں بھی عجمی رنگ کافی نمایاں ہے۔ لیکن

دولت مغلیہ کے شجر اقبال میں گھن لگتے ہی قدیم دقیانوسی رنگ نے پلٹا کھایا۔ اور جناب محسن نے بھی زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ کے مقولہ پر مہر تصدیق ثبت کردی اور خالص ہندی سماج میں ہندی ماحول کو پیش کرکے دنیائے ادب میں بقائے دوام کا اکلیل جہانبانی سر پر رکھا۔

جناب محسن میانہ قد، گندمی رنگ کے تھے اور چہرہ گول۔ اُن کے چہرہ پر چند داغ چیچک کے بھی موجود تھے مگر ایسے کہ بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اکثر داڑھی خشخشی رکھواتے اور شروع میں خضاب کرتے تھے آخر حصۂ عمر میں داڑھی بڑھالی تھی اور خضاب ترک کردیا تھا۔ برادران وطن کا خیال ہے کہ وہ ہر معاملہ میں متانت اور سنجیدگی سے کام لیتے تھے۔ ان کی آواز میں نرمی اور لوچ تھا۔ اس کے ساتھ خوش تقریر بھی تھے۔ اطاعت والدین میں آپ اپنی نظیر تھے۔ عمر بھر حضرت ابو المحسن حسن (اپنے والد ماجد) کی رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ ہر شخص سے بشندہ پیشانی ملتے اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مین پوری میں جہاں وہ وکالت کرتے تھے تمام شہر بلا قید مذہب و ملت ان کا گرویدہ تھا۔ ہر شخص کے شریک رنج و راحت ہوتے اور دامے درمے۔ سخنے۔ قدمے۔ اسکی اعانت و ہمدردی کرتے تھے۔ غرض جناب محسن قدیم ایشیائی تہذیب کا ایک مکمل نمونہ تھے تمام عمر ایک طرح سے نباہی اور لطف یہ تھا کہ ہر آدمی یہی سمجھتا رہا کہ ہم سے زیادہ مولانا کسی دوسرے سے دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ "شکستن دل دوستاں جہل است وکفارۂ یمین سہل

جناب محسن سفید اور صاف کپڑا پسند کرتے تھے اور قیمتی ملبوسات سے ان کو تنفر تھا۔ جو شان فقر کا لازمی نتیجہ تھا۔ وہ اکثر اعزہ اور احباب کی خفیہ طور پر مدد کرتے رہتے تھے۔

جس چیز نے جناب محسن کو معراج کمال پر پہونچایا وہ ان کی شاعری و انشاپردازی تھی جس کا شہرہ تمام ہندوستان میں ہے۔ ان کا نعتیہ کلام ہند سے عرب و عجم تک مقبول خاص و عام ہوا اور ان کی سخن سنجی اور معجز بیانی کا نکتہ شناسوں کے قلوب پر سکہ جما۔ جناب محسن نے نعتیہ کلام سے شہرت و عزت یا شاعرانہ وقعت حاصل کرنا نہ تھا۔ اور اُن کو کسی دنیاوی صلہ کی خواہش بھی نہ تھی بس یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں خلوص۔ عقیدت۔ جلال۔ ہیبت اور محبت کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ لکھنؤ اس زمانہ میں شیخ ناسخ کے دور تناسخ سے گزر رہا تھا جان عالم۔ امانت۔ مرزا شوق۔ اسیر و امیر کا آفتاب کمال نقطۂ نصف النہار پر تھا لیکن جناب محسن نے اس پریشان ماحول سے علحدہ اپنے لئے ایک نئی شاہراہ منتخب کی اور رسکن کی طرح انھوں نے کلام پاک اور احادیث صحیحہ سے دُر بے بہا چن لئے اور گل و بلبل ہجر وصل کے پیش اُفتادہ مضامین کی جگہ اُن کے اس سینہ سے ایک کامیاب مرصع ساز کی طرح سلک شعر کیا کہ جوہریوں کو داد سخن دیتے ہی بن پڑی۔ سامعین ادب اور

سخن سنجان صوفی مشرب اس شاعری کو خلوص سے سنتے اور درود کے فلک شگاف نعروں سے مجالس کو گرماتے رہتے ہیں۔

جناب محسن کی نادر الکلامی کا بین ثبوت یہ ہے کہ بیان حکایت میں شاعرانہ شوخی، حد و تہذیب و متانت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتی۔ اور مبالغے کے استعارات صلاحیت کا جوہر اپنے ساتھ لئے رہتے ہیں جہاں کوئی امر مناسب موقع ہے اور حدیث صحیح میں اس کی تصریح نہیں تو اس کو اس انداز خاص سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو صاف تمیز ہو جاتی ہے کہ اس قدر مضمون جزو حدیث نہیں ہے بلکہ کلام بزبان حال ہے۔ اُن کی صدا بہار طبیعت حسرت دیاس کے مضامین سے الگ رہتی ہے شگفتگی طبع اور زندہ دلی کی کہربا قوت ہر صنف بیان میں اپنی چمک دکھاتی ہے۔ مضامین کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شان و شوکت بندشوں کی چستی انکا خاصہ طبیعت ہے۔ تشبیب و گریز تو ان کا حصہ ہے اور خاتمہ و مناجات میں، وہ اسلوب جدید کے موجد ہیں۔ گو اس امر میں شبہ نہیں کہ جناب محسن کا کلام تلمیحات کی بنا پر عوام کی سمجھ سے باہر ہے لیکن بندش الفاظ کا سحر اپنا کام کرتا ہے اور سخن شناس اور کم استعداد دونوں طبقوں سے خراج تحسین و آفرین وصول کرتا ہے۔

جناب محسن کاکوروی نے اپنا سارا فضل و کمال مدح رسول میں صرف کر دیا اور کل زندگی نعت گوئی کیلئے وقف کر دی اور حقیقت یہ ہے کہ اس صنف سخن میں وہ اپنے تمام معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے۔ سخن شناسوں نے ان کی سعی و ہمت پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے، شوکت الفاظ خوبی بندش اور زور طبیعت کی داد تو اغیار نے بھی دی۔

جناب محسن کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔ اول یہ کہ محسن کی شاعری کا آغاز اس دور میں ہوا جب شبنم شاداب، مینا بازار، پنج رقعہ اور سہ نثر ظہوری کی پرستش کیجاتی تھی۔ چنانچہ محسن پر بھی اس دور کے استعارات و مبالغہ آمیز تحریروں کا اثر پڑا چنانچہ آپ کے ابتدائی خطوط مرزا بیدل کے رقعات کا ایک رُخ معلوم ہوتے ہیں۔ غرض محسن کی خصوصیات کلام میں سب سے زیادہ قابل لحاظ ان کی صناعی اور معنی آفرینی ہے اور انھیں صنایع بدایع کے مناسب استعمال سے محسن کا کلام انکے معاصرین کی نعتیہ نظموں سے زیادہ دلکش نظر آتا ہے۔ ابتک نعت کی بے قدری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کی زبان بیشتر عامیانہ ہوتی تھی محسن نے نعتیہ مثنوی کو مثنوی غنیمت کے رنگ میں پیش کیا اور اس خشک و بے آب و گیاہ زمین میں استعارہ و ایہام کا ایسا دریا بہا دیا کہ باوجود تمام تر لکھنوی تکلف و تصنع ان کے زور طبیعت کی داد

خواہ مخواہ دینا پڑتی ہے اور یہی وہ اعجاز ہے جس نے جناب محسنؔ کے کلام میں سحر سامری بھر دیا ہے۔

محسن کے کلیات نعت میں قصاید، مثنویاں، مسدس، رباعیاں، اور غزلیں سبھی کچھ نظر آتا ہے، لیکن قصاید میں اُن کا بہاریہ قصیدۂ لامیہ[۱] بہت مقبول ہوا اور مثنویوں میں چراغ کعبہ۔ سراپا کا مسدس بھی اُن کی قوت شاعری کا بے مثل نمونہ ہے۔

چونکہ قصیدۂ لامیہ کی تشبیب بالکل انوکھی تھی اور اس میں کاشی، متھرا، گنگا جل اور گوکل وغیرہ کا ذکر تھا جو ہندو مذہب کی روایات سے مخصوص ہیں، اس لئے لوگوں کو خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور محسنؔ کا یہ کارنامہ بہت مشہور ہوا۔ اب ہم کہیں کہیں سے ان کے کلام کا انتخاب پیش کرتے ہیں جس سے اُن کی خصوصیات، شعری پر کافی روشنی پڑتی ہے:۔

مسدس سراپا یوں تو سراپا انتخاب ہے لیکن بعض بند تو قیامت کے ہیں رعایت لفظی کے ساتھ مضمون آفرینی اور زور بیان کے ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:۔

ہم دکھاتے ہیں طبیعت سے تماشے کتنے — عالمِ نور میں چھوڑ آئے ہیں شوشے کتنے
حل کئے غنچۂ خورشید سے نکتے کتنے — عقد پروین سے لکھے ہم نے معمے کتنے
سادہ کاغذ ورقِ مہرِ درخشاں ہے آج
دستِ پرنورِ عطارد میں قلمداں ہے آج

یوں خرامندہ بہ شوخی قلم رعنا ہے — موج ہے جس سے خجل غرقِ عرق دریا ہے
بال پرواز پری چٹکیوں میں اُڑتا ہے — آہوئے شوخ ہے کیا، کبک خراماں کیا ہے
کوئی شاخ آہوؤں کی جلوہ گری میں تو نہیں
کوئی سرخاب کا پر کبک دری میں تو نہیں

رعایت لفظی کا طوفان ملاحظہ کیجئے کہ کوئی ایک مصرعہ بھی اس سے خالی نہیں لیکن باوصف اسکے روانی کا یہ عالم ہے کہ طبیعت اس سے ایک خاص سرور حاصل کرتی ہے۔

خاقانی کی طرح بعض جگہ وہ علمی اصطلاحات سے بھی استعارہ کرتے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ۔ مثلاً

تیری صورت سے کھُلے معنی ماقلّ و دلّ — انبیا شرحِ مفصّل ہیں تو متنِ مجمل

---

[۱] اس کا مطلع یہ ہے:۔
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

تو ہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں بنی — تو ہے شمسیہ، تصوریں تو سب ہیں قطبی

ان اشعار میں علم منطق کی اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے۔ شمسیہ اور قطبی منطق کی مشہور کتابیں ہیں۔

تشبیہات و استعارات کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے بڑی چیز ندرت و جدت ہے اور کلام محسن میں اس کی بھی کمی نہیں، رسول اللہ کے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک رگ بہ شکل الف نمایاں تھی۔ اس رگ کے ساتھ ابرو اور آنکھ کو ملا کر محسن نے عجیب ندرتِ خیال سے کام لیا ہے ملاحظہ ہو:۔

رگ جو کانٹا ہے تو شاہین[1] ترازو ابرو — مردمک سنگ ہے اور پلہ ہے چشم دلجو
آنکھ پڑ جائے اگر جانب امت سر مو — صاف رکھی رہے میزانِ قیامت یکسو
آپ پلے پہ ہمارے ہوں تو کیا کھٹکا ہے
مردم چشم کہیں ہم نے اسے تولا ہے

ترازو اور وزن کے متعلق کوئی بات باقی نہیں رکھی اور لطف یہ ہے کہ سامع یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ ان کو قصداً استعمال کیا گیا ہے۔

چہرۂ نبوی کی تعریف کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

روبرو آئے جو آئینہ تو اک سکتا ہو — شمع کے بھی دھوئیں اُڑ جائیں جو کچھ دعوا ہو
شامت آجائے جو خورشید کو یہ سودا ہو — صبح ہو جائے قمر حُسن پہ گر بھولا ہو
حشر برپا ہو جو کنعانی مقابل آئیں
چرخ پر سورۂ یوسف کو ملک لیجائیں

آئینہ - سکتا - شمع - دھواں - خورشید - قمر - صبح - کنعان - یوسف، الغرض کوئی رعایت لفظی ایسی نہیں جو چھوڑ دی ہو لیکن انداز بیان کی بیساختگی نے ان سب کو ایک "خوشگوار نوش" بنا دیا ہے۔

لب کی تعریف کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

لب جاں بخش کی تشبیہ دم عیسیٰ سے — دی نہ، دم دیتے رہے گرچہ مسیحا بھی مجھے
آب حیواں نہ کہا خضر نے گو چھینٹے دئے — اب فقط رہ گئے خورشید کے جھوٹے شوشے
کہوں یاقوت تو وہ باتیں یہاں پائیں نہیں
لعل سمجھوں اسے آنکھیں مری پتھرائیں نہیں

[1] شاہین ترازو اس ڈنڈی کو کہتے ہیں جس سے دونوں پلے متعلق رہتے ہیں۔

محاورات کے ساتھ لفظی رعایت کا ایسا دلکش امتزاج، "نعت" گوئی کے سلسلہ میں سوائے کلام محسن کے کہیں اور نظر نہیں آتا۔

سراپا کا آخری بند بھی ملاحظہ ہو:-

ہے یہ امید کہ جب گرم ہو بازارِ نشور ۔۔۔ یوں کہے بادشہ بارگہِ عالمِ نور
تو سراپا ہمیں تم دو عوضِ حور و قصور ۔۔۔ میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں ہرگز منظور
مفت حاضر ہے۔ مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسف کی یہ تصویر نہیں

دوسرے مصرعہ میں باوجود توالی اضافات کے جو سلاست پائی جاتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انتخاب الفاظ کی کتنی زبردست قوت محسن کو حاصل تھی۔

مثنویوں میں ایک مثنوی صبحِ تجلی کے نام سے لکھی ہے جس میں ولادت نبوی کا بیان ہے۔ اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

ظلمت کا چراغ بے ضیا ہے ۔۔۔ انجم کا ستارہ ڈوبتا ہے
مہتاب کی چاندنی ڈھلی ہے ۔۔۔ مریخ کی سمت مشتری ہے

زہرہ کا سفید ہو گیا رنگ ۔۔۔ نظم پروین کا قافیہ تنگ

غنچے پہ ہے خامشی کا عالم ۔۔۔ یا صوم سکوت میں ہے مریم
کیاری ہر اک اعتکاف میں ہے ۔۔۔ اور آبِ رواں طواف میں ہے

ہر تخم بہ خلوت آرمیدہ ۔۔۔ ہر ایک ثمر خدا رسیدہ
سجادہ بدوش لالہ یکسو ۔۔۔ یکسو شب زندہ دار شبو

مثنوی چراغ کعبہ بھی بالکل اسی رنگ کی ہے لیکن زیادہ طویل ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

بھیگی ہوئی رات آبرو سے ۔۔۔ داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام ۔۔۔ شبنم کی ردا بہ قصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال ۔۔۔ جھکسا جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

نامحرموں سے چھپائے چہرہ پردیں کو بنائے منھ کا سہرا
آنا کھلتا ہوا نہ جانا انداز خرام صوفیانہ

جگنو کا ہوا میں یہ اشارہ ظلمت کا چمک رہا ہے تارہ
ہر باغ نثارِ روئے شبّو ہر دست شکارِ چشمِ آہو
ظلمت میں ہے نور کی تجلی بکھری ہوئی طور کی ہے چوٹی
ہر قطرہ وضو کی فکر میں گم ہر ذرہ کئے ہوئے تیمم

ابر رحمت گھرے ہوئے ہیں کچھ رات سے دن بھرے ہوئے ہیں
شبنم کے ہے پر لگائے گلشن بلبل سے کہو کہ پکڑے دامن
ذروں کی طرح نہ دشت اڑ جائیں دیوانوں کہئے ہوش میں آئیں

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل کھیت اس کا بہشت، خلد جنگل
مہ پارہ فلک سے آنے والا اطلس کو کتاں بنانے والا

گوہر کو بنا دیا سمندر آئینہ کو کر دیا سکندر

کلیات میں ایک مختصر سی مثنوی "شفاعت و نجات" کے عنوان سے بھی نظر آتی ہے جس میں سرکارِ عشق سے خطاب کیا گیا ہے۔

اس کے بعض اشعار کا رنگِ تغزل ملاحظہ ہو:۔

ذرا عشق اِدھر دیکھے بھالے ہوئے قدم اے ستمگر سنبھالے ہوئے
جفا تیری جیتوں میں اے بیوفا سپر دہی سے کے قبضہ میں دستِ قضا
جو تو رہنما ہے تو رہزن ہے کون تجھے دوست سمجھیں تو دشمن ہو کون
ترے داغ سے دل ہیں گلکاریاں ترے دم سے آنکھوں میں چنگاریاں
برہمن کو بت کہکے دھوکا دیا بتوں کو خدا کہکے بندہ کیا
تپش مہرِ محشر کی بڑھتی ہوئی ترے حسن کی دھوپ چڑھتی ہوئی

کہاں بل، کہاں پیچ تقدیر کے
یہ لٹکے ہیں زلفِ گرہ گیر کے

محسن نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور اسی مخصوص رنگ میں مثلاً :۔

مولا کی نوازشِ نہاں کھلتی ہے
عزت مری پیشِ قدسیاں کھلتی ہے
کہدو کہ ملک گوش بر آواز رہیں
مداحِ پیمبر کی زباں کھلتی ہے

گو شبہ و شک مری برائی میں نہیں
پر نقص تری بھی رہنمائی میں نہیں
ہے کون پیمبری میں تجھ سے بہتر
مجھ سے بدتر اگر خدائی میں نہیں

ایماں کا غروب ہونے پر ماہ آیا
تب دہر میں وہ سید ذیجاہ آیا
جلدی ہوئی ایسی کچھ اسی عالم تک
سایہ بھی حضور کے نہ ہمراہ آیا

محسن نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن بہت کم۔ چند اشعار اس صنفِ سخن کے بھی پیش کئے جاتے ہیں :۔

حالت نہ پوچھئے مرے شیب و شباب کی
دو کروٹیں تھیں عالمِ غفلت کے خواب کی
ہونے نہ پائی خشک بھی تر دامنی مری
محشر میں دھوپ ڈھلنے لگی آفتاب کی
اُن کو کبھی خیال ہو میرا یہ وہم ہے
جاگیں مرے نصیب یہ باتیں ہیں خواب کی

مشیر احمد علوی۔ بی۔ اے۔ کاکوروی

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف سہارنپور

گلدستۂ "بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے، یا یوں سمجھئے کہ "در زبان شاعراں" حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت دس چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی دیوان کی ضرورت ہو علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت مع محصولڈاک ۸؍ عہ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔

ملنے کا پتہ :۔ منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

ڈھائی سیر آٹا

(۱)

بردائی چل رہی تھی - مولی کو بائی نے پکڑ رکھا تھا - اور آٹھ دس روز سے کام پر جانے کے قابل نہیں رہا تھا دو تین روز تک جو دو چار پیسے جمع تھے وہ خرچ ہوئے - اور پھر اُدھار پر کام چلتا رہا - دو چار روز کے بعد بنیا بھی حیلے حوالے کرنے لگا - مجبوراً ایک دن مولی ٹانگ میں ذرا آرام پاکر صبح تڑکے ٹوکری لیکر مزدوروں کی بازار گیا - کئی کاریگروں کے ساتھ کام کر چکا تھا - ان میں سے ایک نے جس کا کام لگا ہوا تھا اس کو ساتھ لے لیا - دن بھر اینٹ گارا ڈھوتا رہا - شام کو ساڑھے چار آنے پیسے ملے - جسے لیکر گھر چلا - راستہ میں ایک آنہ بنئے کو قرضہ کا ادا کیا - ایک آنہ مکان کے کرایہ کے لئے رکھ لیا - اور ایک پیسہ کل کے چبینے کے لئے بچا لیا - باقی بچے نو پیسے اس میں سے ایک پیسہ کے آلو - ایک کا باجرے کا آٹا - پانچ پیسے کے ڈیڑھ سیر چاول - اور ایک پیسے کی دال ایک پیسہ کی لکڑی لیکر ایک لمبی سی گلی میں گھس گیا - جو آگے چل کر اتنی تنگ ہو گئی تھی کہ وہاں ابھی سے اندھیرا تھا - اس گلی میں برابر برابر کئی کوٹھریاں بنی تھیں - دو ایک سے دھواں نکل رہا تھا جو ٹھنڈا ہو کر گلی میں بھر رہا تھا - مولی کی بیوی منی جس سے شادی تو نہیں ہوئی تھی مگر پندرہ برس سے تعلقات میاں بیوی ہی کے ایسے تھے -

دو لڑکیاں اور دونوں سے چھوٹے لڑکے جاڑے کے مارے پاس پاس بیٹھے مولا کا انتظار کر رہے تھے سبھوں نے خوش ہو کر اس کو گھیر لیا - یہ تھکا ہوا بہت تھا، زمین پر بچھے ہوئے ٹاٹ پر لیٹ گیا - اور پوٹلی رکھکر بولا -

"سب لیتا آیا ہوں"

بیوی چولھے کے پاس گئی، جو اسی کوٹھری میں ایک طرف بنا ہوا تھا - آگ سلگائی، اور دال چاول پکنے کو چڑھا دئے لڑکے اور لڑکیاں چولھے کو گھیر کر بیٹھ گئے اور دال پکنے کی دل خوش کن - کھدر کھدر، سننے لگے - ان لوگوں کے لئے اس سے بہتر اور کوئی موسیقی نہیں ہو سکتی تھی -

کمرے میں سیل اور میلے کپڑوں کی بو پھیلی ہوئی تھی - اب وہاں دھواں بھی بھرنے لگا - مگر سب کی توجہ چولھے کی طرف تھی - لڑکے بھوک سے پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ دال چاول جلد سے جلد پک جائیں -

اس لئے وہ اکثر زیادہ لکڑی چولھے میں لگا دیتے۔ یہ دیکھ کر ان کی ماں ڈانٹ دیتی۔

"کمبختوں! کل کھانا کیسے پکے گا؟"

بڑی لڑکی جس کی پلکیں بال خورے نے غائب کر دی تھیں چولھے کے برابر بیٹھی مسلسل بدن کھجلاتی جاتی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لکڑی کی ڈوئی سے دال، اور چاول نکال کر چٹکی سے ملتی۔ اس وقت لڑکے پوچھتے۔

"کتنی دیر ہے؟"

"بس تھوڑی ہی کسر اور ہے"

یہی جواب آدھ گھنٹہ تک چلتا رہا۔ مولی ایک پرانی دری اوڑھے جس میں سیکڑوں چھید تھے ٹاٹ پر خاموش لیٹا تھا تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

جیسے نیند آ رہی ہے"

اتنے میں کسی کے چیخنے اور رونے کی آواز آنے لگی۔ کوئی مزدور تھا جو تاڑی پیا کرتا تھا اور اکثر اپنی بیوی کو مارتا تھا۔ جب غل غپاڑا زیادہ ہوتا تو آس پاس کے لوگ جا کر معاملہ رفع دفع کرا دیتے اسوقت یہ غل سُنکر منی بولی:۔

"ان لوگوں کے یہاں روز بروز یہی رہتا ہے۔ نہ معلوم کیسے کمینے ہیں"

مولی۔ ہونہہ — چاول گلے نہیں اب تک؟

منی نے دیکھا چاول گل گئے تھے اُتار لئے گئے۔ ہانڈی بند تھی۔ مگر اُبال میں ہانڈی کے کگروں پر کچھ چاول آ گئے تھے۔ چھوٹے لڑکے بو نے اس میں سے دو تین چاول پوچھ کر کھالئے۔ دوسرا لڑکا منو فوراً بولا۔

"ہونہہ۔ میں بھی"

اس نے اور زیادہ کھالئے۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہونے ہی والی تھی کہ منی نے دونوں کو ڈانٹا۔

"کمبختوں میں ذرا صبر نہیں۔ میں کہتی ہوں —

تھوڑی دیر لڑکے منی کی بات پوری ہونے کے منتظر رہے۔ جب وہ کچھ نہیں بولی۔ تو پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب دال کا سب کو بہت بے صبری سے انتظار تھا۔ آخر ایک لڑکی بولی:۔

"اماں اب گھونٹ دو"

ماں نے دال کو دیکھا تو وہ تھوڑی بہت گل گئی تھی۔ اب زائد انتظار کون کرتا۔ اس نے دال گھونٹ کر نمک ڈالا اور اُتار لی۔ پھر تین تامچینی کی پلیٹیں جس کی چینی تقریباً بالکل اُڑ گئی تھی اور ایک مٹی کی رکابی سامنے رکھی۔ پہلے ایک بڑی پلیٹ میں چاول نکالے اور اس پر دال ڈال کر مولی کے سامنے رکھدئے۔ مولی بہت بے صبری سے کھانے لگا

سب بچے اب ٹکٹکی باندھ کر منی کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہے تھے۔ اس نے مٹی کی تھالی میں چاول دال نکال کر دونوں لڑکیوں کو دئے اور پھر تامچینی کی دونوں پلیٹوں میں برابر برابر چاول نکالے۔ اس پر دال ڈالی

بو۔ "منو کی پلیٹ میں اتنا اور ہماری پلیٹ میں اتنا"

منی نے تھوڑی سی دال اس کی پلیٹ میں اور ڈالدی۔

منو۔ "اماں ہم بھی"

ماں نے دو چار چاول اس کی پلیٹ میں بھی ڈالدئے۔ اور پھر باقی چاولوں کو دال کی ہانڈی میں اُلٹ کر خود کھانے لگی۔ ابھی چولھے میں کچھ کوئلے باقی تھے جن کی ہلکی ہلکی روشنی میں ان لوگوں کے چہرے اور چلتے ہوئے منھ دکھائی دیرہے تھے۔ چھوٹے لڑکے کھاتے جاتے اور پلیٹ کی طرف دیکھ کر اندازہ کرتے جاتے کہ ابھی اتنا اور ہے، اتنا اور ہے۔ آخر منو اپنی پلیٹ پوچھ کر بولا۔

"بس — کھا چکے"

مولی بھی چاول ختم کر چکا اور بولا۔

"چاولوں میں خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ ذرا سے کھالو اور پیٹ بھر گیا۔ اور روٹی کا یہ ہے کہ سیر بھر آٹے کی ہو تو کچھ نہیں۔ اور دو سیر ہو تو کچھ نہیں"

بو۔ "اماں! صبح کو کیا پکے گا؟"

منی۔ "میں کہتی ہوں ان لوگوں کی نیت کبھی نہیں بھرتی۔ ابھی کھا چکا ہے۔ اب پوچھ رہا ہے کل کیا پکے گا"

منی نے بانس کے پلنگ کے نیچے سے جو کوٹھری کا چوتھائی حصہ گھیرے ہوئے تھا ایک پاندان نکالا۔ جس کا پیندا گھس گیا تھا۔ اور سب کلھیاں ایک دفتی پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ پاندان منی کی ماں کا تھا اور اس کو بہت عزیز تھا۔ ہمیشہ سوچا کرتی تھی کہ میں کسی گھر میں اوپر کا کام کاج کرنے کو نوکر ہو جاؤں تو سب سے پہلے اسی کو ٹھیک کراؤں گی منی نے ایک پان کے چار ٹکڑے کئے ایک خود کھایا۔ ایک مولا کو دیا اور دو دونوں لڑکیوں کو۔ پھر کوٹھری کے بیچ میں ایک ٹاٹ کا پردہ ڈالدیا گیا جس سے اس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک طرف پلنگ ہو گیا۔ اور دوسری طرف ٹاٹ کا فرش۔ پلنگ پر منی اور مولی لیٹ گئے۔ اور ٹاٹ پر دونوں لڑکے اور دونوں لڑکیاں۔ سردی تیز ہو گئی تھی۔ مولی اور منی نے تو ہی دری اوڑھ لی۔ اور لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی کسی نے موٹی چادر، اور کسی نے ٹاٹ کا ٹکڑا ادھر اُدھر اوڑھ لیا۔ اور پھر چڑیا کے بچوں کی طرح ایکدوسرے سے چپک کر لیٹ رہے۔ کوٹھری کے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی، اس لئے مولا نے اُٹھکر اس کو بند کر دیا ہوا کی آمد و رفت بند ہو گئی، اور کوٹھری میں حبس کی وجہ سے گرمی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد منی بولی۔

"آج منشی جی پھر آئے تھے - اور کہہ گئے ہیں کہ نواب صاحب نے حکم دیدیا ہے کہ جس پر کرایہ چڑھا ہو اس سے کوٹھری فوراً خالی کرالو"

مولی - "نکالدیں گے - نکالدیں گے - جب سنو یہی ہے - آئیں - آکر نکالیں - ہم جاڑوں میں بچوں کو لیکر کہاں جائیں - ہوا کریں وہ بڑے آدمی - ہم تو نہیں نکلیں گے - کہدو جب کرایہ جمع ہو جائے گا دیدیں گے - ضرور دیں گے مر جائیں تو بات دوسری ہے - بڑے آئے ہیں نکالنے والے"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی ہوگئی - پھر مولی بولا -

منشی جی کے یہاں کی نوکری کا پتہ چلا -

منی - "وہ کہتے ہیں چھوٹی لڑکی سے میرا کام نہیں چلے گا - ایسی لڑکی ہو جو جھاڑو بہارو کرے، اور دو گھڑے پانی اُٹھاکے رکھدے" اس کے بعد منی ذرا رکی پھر آواز نیچی کرکے بولی :-

"میں کہتی ہوں کہ جوان لڑکی کو کیسے بھیجدوں - اس موئی کا بھی دیدہ ہوائی ہے - پانی بھرنے جاتی ہے تو ٹھٹھا کرتی ہوئی"

مولی - "جائے گی تو حرامزادی اپنے سے جائے گی - ایک چلی گئی تو کیا کرلیا؟ لڑکا ہوتی تو چار آنہ روز کماتی"

مولی کی بڑی لڑکی بھاگ گئی تھی - اور سال بھر سے پتہ نہیں تھا -

منی - "کرکیا لیا؟ موئی تھی ہی ایسی - ایسی نہوتی تو جاتی کیوں؟ لڑکے کب اچھے نکلتے ہیں؟ کس نے لاکر ماں باپ کو کھلایا ہے؟ اِدھر کمانے کے قابل ہوئے، اُدھر چلدئے - بھورے کو دیکھو - ٹھیلہ چلاتا ہے - دس آنے روز پاتا ہے اور سب اُڑا دیتا ہے"

منی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہوگئی - اور پھر مستقل خاموشی چھا گئی - جس کو کبھی کبھی ان لوگوں کی کھانسی کی آواز برطرف کر دیتی تھی - ابھی آٹھ ہی بجے تھے، اور بازار میں چہل پہل تھی - مگر یہاں سوتا پڑ گیا -

(۲)

صبح جب مولا کی آنکھ کھلی تو اس نے منی کو جاگتا پایا - پانچ منٹ تک پلنگ پر پڑا رہا - پھر کراہتا ہوا اُٹھا، اور بولا -

"سردی کے مارے جان نکلی جاتی ہے - بدن جیسے تختہ ہوگیا - بیڑی کہاں ہے؟"

منی نے اُٹھکر ایک کونے سے ایک بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر دی - مولی نے ایک بیڑی سلگائی اور پینے لگا اور بیڑی جب تک ابھی سے پکڑنے کے قابل رہی اس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑی - پھر پلنگ سے اُٹھا، اور لوٹا لیکر باہر چلا گیا - پندرہ منٹ کے بعد سردی سے کانپتا ہوا اندر آیا - اور لوٹا رکھکر بولا -

"ایک بیڑی اور- اتنا دن چڑھ آیا، دھوپ کا پتہ نہیں۔"

موںی نے ایک بیڑی اور سلگائی- پھر ٹوکری اُٹھا کر بیڑی پیتا ہوا باہر چلا گیا۔

موںی کے جانے کے دو گھنٹہ بعد منی لڑکوں، اور لڑکیوں کو لیکر باہر نکلی- اور کوٹھری میں کنڈی لگا کر ٹہلنے چلی- کچھ دور پر دوسرے مزدوروں کی عورتیں دھوپ میں بیٹھی بک بک کر رہی تھیں، یہ جا کر اس میں شریک ہوگئی- لڑکے اور چھوٹی لڑکی آنکھ بچا کر ادھر اُدھر ہو رہے۔

تین چار گھنٹہ کے بعد منو آیا اور ماں سے کہنے لگا:-

"ماں رے! بھوک لگی ہے۔"

منی ویسے ہی باتوں میں مشغول رہی- گویا یہ سننے والی بات ہی نہ تھی- تھوڑی دیر کے بعد ببو آیا اور اس نے بھی اسی فقرے کو سنایا- مگر اس نے ادھر بھی توجہ نہ کی- اسوقت وہ کسی شریف گھرانے کے گھر کی عورتوں کی بدچلنی بہت جوش و خروش سے بیان کر رہی تھی- اس جوش میں یہ فخر پوشیدہ تھا "کہ چھوٹی ذات سہی- مگر میں ایسی نہیں ہوں۔" تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا- یا دونوں کے دونوں، اپنی صدا لگا دیتے اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا- اب چھوٹی لڑکی بھی کہیں سے آئی اور ماں کے پاس بیٹھ گئی پھر چپکے سے بولی۔

"اماں چلو۔"

منی- "ابھی سویرا ہے- ذرا ٹھہرو۔"

دس منٹ اور گزرے اب تو ببو ماں کا کندھا پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور رونی آواز سے رٹ لگا دی۔

"کھانا دو- کھانا دو- کھانا دو۔"

منی تھوڑی دیر تک یہ ریں ریں سنتی رہی- پھر اس کو ڈانٹ دیا- جس پر بھوں بھوں رونے لگا- آخر یہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی۔

"میں کہتی ہوں- یہ سب غارت ہوں- یا میں غارت ہوں- زندگی دو بھر ہے موئی۔"

منی نے کوٹھری میں آکر آگ سلگائی- اور باجرے کے آٹے کی پانچ ٹکیاں پکائیں- دو چھوٹی، اور تین بڑی ان پر ذرا ذرا سا گڑ رکھ کر چھوٹی دونوں لڑکوں کو دیں اور بڑی خود لی اور دونوں لڑکیوں کو دیں- ان لوگوں کا کھانا تین چار منٹ کے اندر ہی اندر ختم ہو گیا- اور پھر یہ سب لوگ گھومنے چلے گئے۔

شام کو موںی جب مزدوری کے پیسے لئے پلٹ رہا تھا تو اس کی نگاہ گلی کے کونے پر پڑی- دیکھا تو دو، ڈھائی سیر آٹا یوں ہی پڑا ہوا ہے- اس نے قریب جا کر آٹے کو چٹکی میں اُٹھایا- گویا یہ یقین کرنا چاہتا ہے کہ آنکھیں دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں- جب یقین آگیا تو متحیر کھڑا رہ گیا- دل کہتا تھا کہ اُٹھا لے چلو- مگر ایک تو یہ ڈر کہ شاید

کوئی کچھ کہے۔ اور دوسری یہ جھجھک کہ اس کے ساتھی مزدور بھی پیچھے آرہے ہوں گے۔ اگر وہ مجھے آٹا اٹھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ آخر آٹا اُٹھانے کی ہمت نہیں پڑی اور یہ چل کھڑا ہوا۔ مگر ہر قدم پر رفتار سست ہوتی جاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہی قدم پہونچکر بھوچکا سا کھڑا ہوگیا۔ جیسے چوراہے پر پہونچکر راستہ بھول گیا ہو یہ سوچ رہا تھا کہ کوئی دوسرا مزدور اس آٹے کو ضرور اُٹھا لیگا۔ مجھے نہیں ملے گا اور اس کو مل جائے گا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا گہرا ہوگیا کہ مولا خیالی آٹا اُٹھانے والے مزدور کو حد سے زیادہ رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا اور یہ سوچتا ہوا آٹے کی طرف واپس آیا۔ بلا سے کوئی ہنسے گا، تو ہنس لے گا۔ بیوی بچے تو آٹا پاکر خوش ہوجائیں گے مولی کے قدم اتنے جوانمردی سے آٹے کی طرف بڑھ رہے تھے گویا وہ کسی ڈوبتے ہوئے لڑکے کو دریا سے نکالنے جارہا ہے آٹے کے پاس پہونچکر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اپنا انگوچھا پھیلا دیا۔ اور آٹا اُٹھانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔

”کیا لوگ ہیں! اناج اس طرح پھینک دیا۔ پیروں تلے اگ آئے۔ نالی میں الگ جائے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ مرغی چرغی کھالیتیں۔

جس بات کا ڈر تھا وہی ہوئی۔ پانچ چھ مزدوروں کی ایک ٹولی پاس سے گزری۔ اور یہ عجیب تماشا دیکھکر تین چار مزدور کھڑے ہوگئے۔

ایک۔ ”کیا مل گیا مولی“

مولی۔ ”کچھ نہیں۔ خراب آٹا ہے۔ مگر ہے تو اناج۔ پیروں تلے آرہا تھا۔ میں نے کہا مرغی بکری کھالیں تو سوارت ہوجائے“

دوسرا۔ ”کیا گلی کی پڑی ہوئی چیز! کہیں نظر گزر ہو“

پہلا۔ ”اُٹھالے۔ اُٹھالے۔ اس کو بکنے دے۔ کام آجائے گا“

مولی۔ گردن جھکائے اپنے کام میں مشغول رہا۔ یہ لوگ چل کھڑے ہوئے۔ کچھ ہی دور پہونچکر ایک مزدور نے تان لگائی:۔

”سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا“

دوسرا اس کے تان ہی کی اثنا میں بولا۔

”غریب سہی، مگر ہم گلی سے گرا پڑا نہیں اُٹھاتے“

یہ مزدور بڑائی کی لے رہے تھے۔ مگر حقیقت میں ان میں سے ہر ایک کو مولی کی اس خوش نصیبی پر کہ اتنا آٹا یوں ہی پڑا مل گیا رشک وحسد ہو رہا تھا ——— اس آٹے کا بھی عجیب قصہ ہوا۔

(۳)

دس بجنے کے قریب تھے، مگر کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔ شوکت میاں اسکول جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ ان کی پھوپھی نے جلدی جلدی دو چار روٹیاں ڈلوادیں اور چار کباب تلدئے۔ جلدی سے ان کو میز پر چُن کر شوکت میاں کو کھانے کے لئے آواز دی، شوکت میاں ایک ہاتھ میں کتابیں لئے دوسرے ہاتھ سے شیروانی کے بٹن لگاتے کھانے کے کمرے میں گھس گئے۔ اور بلا ہاتھ دھوئے کھانا شروع کر دیا۔ مگر پہلا ہی نوالہ منھ میں رکھا تھا کہ ایسا منھ بگاڑ لیا گویا کونین پی گئے ہوں۔ جلدی سے وہ نوالہ پانی کے سہارے پیٹ میں پہونچا دیا، اور پھر روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منھ میں رکھا۔ چبایا۔ اور پھر منھ بگاڑ کر بولے۔

"پھوپھی جان! آٹا خراب ہے"

"آٹا خراب ہے!! کیا؟"

"شاید اکرا گیا"

پھوپھی نے بھی روٹی کا ذرا سا ٹکڑا منھ میں رکھا۔ اور پھر بولیں:۔

"تمہاری باتیں! "اکرا گیا" کچھ روٹیاں جلدی پکنے سے دھواں گئیں"

شوکت میاں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ جلدی سے کتابیں اُٹھا کر بھاگتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیگم صاحبہ دھوپ میں بیٹھی کچھ سی رہی تھیں۔ اپنے بیٹے کو اتنی جلدی کھانے کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر بولیں:۔

"کیا بات ہے؟"

شوکت میاں کی پھوپھی ــ کچھ نہیں۔ ذرا روٹیاں دھواں گئیں"

بیگم صاحبہ ــ "میری سمجھ میں نہیں آتا، شوکت میاں کب تک فاقے سے اسکول جاتے رہیں گے۔ ذرا روٹیاں میں تو دیکھوں!"

شوکت میاں کی پھوپھی ایک پلیٹ میں روٹی رکھ کر سامنے لائیں۔ بیگم صاحبہ نے ذرا سا ٹکڑا منھ میں رکھا اور بولیں:۔

"یہ دھواں گئیں ہیں۔ میں کہتی ہوں بہن تم کو کب عقل آئے گی۔ "اکرایا ہوا آٹا میرے بچے کے سامنے رکھدیا۔ جہاں میں ذرا غافل ہوئی بس دلدّر پنا ہونے لگتا ہے"

اس فقرہ کا نشانا پھوپھی تھیں۔ یہ بیچاری بو میاں کے باپ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ دس برس ہوئے بیوہ ہو گئیں تھیں اور ان کا یا ان کی لڑکی کا بجز اسی گھر کے اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ بظاہر تو یہ ایک

غریب بہن کی طرح رکھی جاتی تھیں۔ مگر حقیقت میں یہ "صدر ماما" یا نوکروں کے انچارج کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ اور ہر قسم کی بدنظمی کی براہ راست ذمہ دار تھیں۔ بیگم صاحبہ کا الزام سن کر بولیں :۔

" اے میں نے تو بھلے کی سوچی تھی۔ چھوٹی مٹکی میں آٹا تھا۔ میں نے کہا۔ کیوں پڑا رہے۔ کام ہی آجائے "

" یہ نہ ہوا کہ دیکھ لیتیں آٹا ہے کیسا ؟ وہ تو روٹی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے ——— خیراتن "

ان کی آواز پچیس گز کا فاصلہ طے کر کے اسی کڑک سے باورچی خانے پہونچی۔

خیراتن "——جی بیگم صاحبہ ——— پکار رہی ہوں "

" سب آٹا نالی میں پھینکدے۔ بڑے لگرے سے آٹا نکال کر پکا "

شوکت میاں کی پھوپھی اس حکم کی تعمیل کرانے دوڑیں اور باورچی خانے میں آکر بڑبڑانے لگیں۔

" نالی میں پھینک دو۔ نالی میں پھینک دو۔ سچ ہے کہ جب چیز ہوتی ہے تو اس کی قدر نہیں ہوتی اناج بڑی چیز ہے بہن! بڑی چیز "

خیراتن —" ہاں گندھا گندھایا آٹا۔ سب محنت اکارت "

" تم پھیکو دیکو نہیں۔ لیتی جا ؤ بکری کو کھلا دینا۔ ہاں، اور دیکھو مٹکی میں ابھی ڈھائی دو سیر آٹا اور ہو گا دو آنے دس پیسے کا مال ہے۔ وہ بھی تم لیتی جاؤ۔ میں پھکوا کر کیا کروں گی "

خیراتن چاہتی تو تھی کہ آٹا لیجائے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ پھوپھی مری بچھیا برہمن کے نام کر کے احسان کرنا چاہتی ہیں۔ بولی :۔

" ہاں، آٹا لیجا کر کسی کونے میں ڈالدوں گی۔ پیر دل تلے نہ آئے۔ اب ہے یہ کس کام کا "

پھوپھی نے اس ڈر سے زیادہ باتیں نہیں کہیں کہ کہیں خیراتن آٹا لیجانے سے بالکل ہی انکار نہ کر دے۔ اور اس طرح ذرا ظہور احسان کرنے کا جو موقع مل رہا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ فوراً کوٹھری کے اندر جا کر آٹا اپنے ایک میلے ڈوپٹے میں باندھ لائیں اور بولیں :۔

" ذرا ڈوپٹہ کا خیال رکھنا۔ پھٹنے نہ پائے۔ اور شام ہی کو اپنے ساتھ لیتی آنا "

خیراتن نے پوٹلی کی طرف ایک نظر ڈالی، اور پھر کام میں مشغول ہو گئی۔ جب گھر جانے لگی تو پکی ہوئی روٹیاں۔ گوندھا ہوا آٹا اور آٹے کی پوٹلی سب سامان لیکر گھر آئی۔ خیراتن کی بڑی لڑکی نے، جو شوہر سے لڑائی ہونے کی وجہ سے مستقل ماں کے پاس رہتی تھی۔ اس سامان کا حال پوچھا۔ جب خیراتن نے قصہ بیان کیا تو اس نے روٹی چکھی اور پھر بولی :۔

" کھانے کے قابل نہیں۔ کڑوا ہو گیا "

"بکری کھالیگی"

"اس کا دودھ نہ گھٹ جائے گا"

خیراتن نے اُٹھکر روٹیاں بکری کے سامنے ڈالدیں۔ اس نے ایک روٹی تو کھالی۔ مگر اس کے بعد مُنھ ہٹالیا۔ پھر ان لوگوں نے لاکھ چمکارا گر وہ ادھر متوجہ بھی نہیں ہوئی۔ اور ادھر متوجہ کیسے ہوتی۔ وہ تو بیگم کے یہاں کے بچے کھچے مرغن کھانوں پر پلی تھی۔ اسوقت بھی اسی سے پیٹ بھرا تھا۔

اب خیراتن سوچ میں پڑگئی کہ آٹے کا مصرف کیا ہو۔ بیٹی نے تجویز پیش کی۔

"دُلارے کی نظر اُتار کر چوراہے پر ڈالدو"

یہ تجویز معقول تھی۔ اگر آدھ سیر تک آٹا ہوتا تو اس پر ضرور عمل کیا جاتا۔ مگر اکدم سے ڈھائی سیر آٹا اس طرح پھینکنے پر خیراتن کے دل نے گواہی نہیں دی۔

رات کو جب خیراتن کام کاج سے واپس آئی۔ اور اطمینان سے کھانا کھا کر لیٹی تو یہ مسئلہ اُٹھا کر آٹے کا کیا ہو۔ دوست اور عزیزوں کی فہرست دہرائی۔ مگر کوئی کام آتا شخص نظر نہ آیا۔ صبح کو ایک فقیر نے صدا لگائی، خیراتن نے موقع غنیمت جانا اور فوراً پاؤ بھر آٹا نکال کر بھیک دینے لگی۔ مگر فقیر تھا شہر کا۔ آٹا دیکھ کر بولا:-

"مائی فقیر کو خراب چیز نہ دیا کر۔ اللہ بھلا کرے"

یہ کہکر چلتا ہوا۔ خیراتن آٹا لئے بڑبڑاتی اندر آئی۔

"موئے۔ موئے فقیر۔ بھیک مانگنے چلے ہیں"

اب پھر وہی مسئلہ - آٹے کا کیا ہو؟ سہ پہر کو ایک عورت دو بچوں کو ساتھ لئے ان کے گھر میں آئی۔ اور اس نے اپنی کتھا یوں سنائی۔ میں کوئٹہ کی رہنے والی ہوں۔ زلزلے میں میرا سب کچھ تباہ ہوگیا۔ میرے باغات تھے۔ بڑے بڑے مکانات تھے شوہر اور لڑکے تھے۔ مگر سب تباہ ہوگئے۔ اور میں دکھیا در بدر گھوم رہی ہوں۔

خیراتن کو اور اس کی بیٹی کو ان تینوں کے حال پر بڑا ترس آیا۔ اور سب آٹا اُٹھا کر یک مشت ان لوگوں کو دیدیا ---- وہ عورت غریب آدمیوں سے خلاف توقع اتنا آٹا پاکر متعجب ہوئی۔ مگر عورت تھی، ان عورتوں کے خلوص میں اسکو شک ہوا۔ ذرا دور گلی میں جاکر اس نے پوٹلی کھولی۔ جب حقیقت معلوم ہوئی تو خوب بڑبڑائی۔ کوسنے دئے اور آٹا گلی میں ڈالکر چلتی ہوئی۔ اس کو خراب آٹے کی کیا پرواتھی۔ اس کی جیب میں آج کی تحصیل وصول کے روپیہ کھنک رہے تھے

(۴)

شام کے وقت منی مولی کا انتظار کررہی تھی۔ اور ببوا اس کے کندھے سے لگا ریں ریں کررہا تھا۔

"اماں بھوک لگی ---- اماں بھوک لگی"

منی ــ دوپہر کو تھیں اور منو کو برابر کی ٹکیاں دیں تھیں۔ دیکھو وہ کہاں روتا ہے۔

منو ایک لال لنگوٹے کا پھٹا کاغذ سر پہ لپیٹے۔ ایک لکڑی ہاتھ میں لئے سپاہی بنا ٹہل رہا تھا۔ یہ سُنکر بولا:۔

"اماں کل اور کم دینا۔ تب بھی ہم نہیں روئیں گے"

منی ــ اب بتا ببو ــ وہ دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے"

ببو غیرت میں آکر خاموش ہوگیا۔ مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد ویسی ہی ریں ریں کرنے لگا۔ اب منی کہنے لگی:ــ

"رو نہیں۔ دیکھو وہ آتے ہوں گے۔ اور تمھارے لئے چیز لاتے ہوں گے"

اتنے میں مولی آٹے کا پوٹلا لئے ہوئے کوٹھری میں داخل ہوا۔ منی نے پوٹلا کھولا۔ اور دیکھکر حیرت سے بولی:ــ

"گیہوں کا آٹا!! کہاں ملا؟"

جب سے مولا بیمار تھا ان لوگوں نے گیہوں کی روٹی نہیں کھائی تھی۔ اسے دیکھکر سب خوش ہوئے۔

مولا ــ "مل گیا ــ دیکھو کتنا ہے!"

منی دوڑ کر کہیں سے ترازو مانگ لائی۔ اور آٹا تولنے کے لئے بیٹھی۔ ایک سیر تولا۔ اور اس کو ایک اور کپڑے میں رکھدیا۔ پھر دوسری بار ترازو بھرا۔ نتیجہ دیکھنے کو سب انتہائی ذوق وشوق سے منتظر تھے جیسے لڑکے اسکول میں امتحان کا نتیجہ سُننے کے منتظر کھڑے ہوتے ہیں۔ آخر منی بولی:ــ

"سوا دو سیر سے کم نہ ہوگا۔ کتنا اچھا آٹا ہے۔ چل چھوکری۔ دیکھ اس کے گیہوں چن۔ پہلے چراغ جلا ــ اندھیرا بہت ہے"

ایک لڑکی نے دوڑ کر ایک میلی سی لالٹین اُٹھا کر جلائی۔ اور پھر دونوں بیٹھ کر گھن چننے لگیں۔ دونوں چھوٹے لڑکے غل مچانے لگے۔

"گیہوں کا آٹا ــ گیہوں کا آٹا"

منی تھوڑی دیر چپ رہی۔ پھر چلا کر بولی:ــ

"چپ رہو کمبختوں۔ کان پھاڑے ڈالتے ہو۔

اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک چھوٹی لڑکی کے کھانسنے کی آواز۔ یا بڑی لڑکی کے بدن کھجلانے کی کھر کھر کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ پانچ منٹ کے بعد منی نے حکم سنایا۔

"بس اب صاف ہوگیا۔ آدھا آٹا کل کے لئے رکھدو"

مولی ــ "اب رکھو گی کیا۔ آج ہی پکالو۔ سب جی بھر کر کھالیں"

دونوں لڑکے ــ "ہاں ــ ہاں ــ میری اماں"

منی آٹا گوندھنے لگی - آٹے میں اب بھی گھن موجود تھے - گوندھنے میں اس کو کچھ شک ہوا - اس نے آٹا نکال کر چکھا - پھر ذرا منھ بنا کر بولی :-

نمک ڈال کر پکانے والا ہے دو پیسے کا تیل لے آؤ تو آج پوریاں پکیں - دو پیسے کے آلو بھی لے آؤ ذرا جا کر بقالی کے یہاں سے کڑھائی تو لانا -

دونوں لڑکے بیتابانہ کڑھائی لینے دوڑے - پیچھے پیچھے چھوٹی لڑکی چلی - مولا بنئے کے یہاں سامان خریدنے لگا - منی نے آٹا گوندھ کر رکھا - اتنے میں لڑکی کڑھائی لئے آ پہونچی اور پیچھے پیچھے دونوں لڑکے پیچھتے ہوئے آئے -

"ہم لیجائیں گے　　ہم لیجائیں گے"

منی نے کوٹھری کے باہر نکل کر کڑھائی مانجی - مولا لکڑی وغیرہ لیکر آیا - لڑکیوں نے آگ بنائی - سب لڑکے چولھا گھیر کر بیٹھے - کڑھائی چڑھائی گئی - منی نے ایک مٹی کی رکابی میں ایک بڑی سی روٹی بڑھائی - کڑھائی میں دو قطرے تیل ڈالا - جب وہ کڑکڑانے لگا تو اس نے روٹی ڈالدی - وہ چرسے بولی - تیل کی بو کمرے میں پھیل گئی - لڑکے کھانسنے لگے - پوریاں پکتے دیکھ کر سب کے چہروں پر بجلی آ گئی -

منو — "اہا ہا کیسی اچھی خوشبو نکلی"

منی نے روٹی دوسری طرف اُلٹی -

منو — کیسی لال لال - اماں یہ ہم کھائیں گے"

ببو — نہیں ہم — ہم —

منی نے پوری اُتاری - پھر کڑھائی میں دو قطرے ٹپکائے - اور دوسری پوری ڈالی - اسی طرح اس نے ایک گھنٹہ میں دھیمی دھیمی آنچ میں سب پوریاں نکال لیں - کھانے میں بہت دیر ہو گئی تھی - مگر خوشی میں کسی کو محسوس نہیں ہوا - پوریاں پکا کر منی چلائی :-

"ارے آلو لاؤ - آلو لاؤ - کسی نے ابھی تک کاٹے ہی نہیں - میں کہتی ہوں یہ چھوکریاں کسی کام کی نہیں - سب کھڑی تماشا دیکھ رہی ہیں"

جلدی جلدی آلو کے پتلے پتلے قتلے کاٹے گئے - اور پھر کڑھائی میں پکانے کے لئے چڑھا دئے گئے - یہ انتظار بیشک کھل گیا - سب خاموش بیٹھے رہے - صرف کھانسی کی آواز اسکو توڑ دیتی تھی - آخر آلو تیار ہو گئے - تیار کیا ہو گئے، ذرا ملائم پڑ گئے - منی نے پلیٹیں نکالیں - اور سب میں دو دو پوریاں اور ان پر تھوڑے تھوڑے آلو رکھ کر سب کے سامنے بڑھا دئے - اب جو ان لوگوں نے خیال کیا تو ببو سو رہا تھا -

منی — "ببو اُٹھ، اُٹھ، دیکھ پوریاں تیار ہوگئیں"

لڑکیاں — اے ببو - ببو -

ببو آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور رونے کی نیت سے پورا منھ کھولکر ایک چیخ لگائی - مگر ابھی چیخ پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کی نگاہ پوریوں پر پڑ گئی - جس کو دیکھکر رونا بھول گیا ——— سب ہنس ہنس کر پوریاں کھانے لگے -

منو — "اہا ہا - کتنی مزے کی ہیں"

چھوٹی لڑکی — "اماں! سالن ہوتا"

بڑی لڑکی — "ہاں! اور پلاؤ متنجن نہوتا - گدھی"

پھر خاموشی ہوگئی - یہ لوگ خوب مزے لےلیکر کھا رہے تھے جس سے اچھا خاصہ شور پیدا ہوگیا تھا جب پوریاں ختم ہوگئیں تو منی نے آدھی آدھی سب کو اور دیں - اور پھر خود بھی لی - مولی نے آٹا ملنے کا قصہ بیان کیا - اس پر منی بولی:— یہ بھی خدا کی دین ہے - میں ببو سے کہہ رہی تھی کہ آج ابا چیز لاتے ہوں گے -

ببو — "اماں ہم گرما گرم پوری والے بنیں گے - اور خوب پوریاں کھائیں گے"

منو — "ہم سپاہی بنیں گے - سب کو پکڑ پکڑ کر جیل خانے بھیجا کریں گے"

ببو — "ہم تم کو پوریاں نہیں دیں گے -

منو — ہم تم کو خوب پیٹیں گے - اور پکڑ کر تھانے میں بند کر دیں گے -

ببو — ہم ——— ہم تم کو ———

ببو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے - اس نے منو کا منھ چڑھا دیا - اس پر منو نے ایک گھونسا رسید کیا مولا نے دونوں کو ڈانٹا ——— "کمبختوں! آج تو خوب ٹھونس ٹھونس کر کھایا ہے - آج تو چپ رہو"

دونوں خاموش ہوگئے - مولا بولا:— "خدا اب روز پیٹ بھر دے"

جب یہ لوگ سونے لیٹے تو ببو بولا:—

"اماں! کہانی کہو"

لڑکیاں — "ہاں، ہاں - بادشاہزادے والی"

منی کی بھی طبیعت آج موزوں تھی - وہ کہنے لگی:—

"ایک تھا بادشاہ — ہمارا تمھارا خدا بادشاہ ———————"

محمد حیات اللہ انصاری - بی - اے (علیگ)

باب المراسلۃ والمناظرہ

مذہب کی کورانہ تقلید

(جناب مشتاق حسین صاحب۔ وکیل ہائیکورٹ لشکر)

ذریعہ ہذا ایک مضمون آپ کو ارسال کرتا ہوں۔ امید کہ اُس کا جواب بذریعہ نگار عطاء فرمایا جائیگا۔ ممکن ہے کہ مضمون مرسلہ اُس معیار پر پورا نہ اُترے۔ جو آپ نے نگار کیلئے مخصوص کر رکھا ہے۔ لیکن عرصہ تک نگار کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے دل میں جو شکوک وشبہات پیدا ہوگئے ہیں۔ میں ان کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ یا بالفاظ دیگر اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے امید کرتا ہوں کہ آپ اس کا جواب معقول عنایت فرما دیں گے۔

میں رسالہ نگار کا تاریخ اجراء رسالہ سے مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں۔ ابتک مذہب اسلام کے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ اور مذہب کے بارہ میں آپ کی جو رائے ہے وہ کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے۔ میں یہ بحث تو کرنا نہیں چاہتا کہ آپ نے معتقدات ومذہبی جذبات کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ وہ صحیح ہے یا غلط۔ لیکن آپ سے یہ معلوم کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اگر تمام رسم ورواج واعتقادات واُصول دادعیان کو آج خیرباد کہدیا جاوے۔ اور بقول آپ کے صرف قرآن کی صحیح تعلیم کو پیش نظر رکھا جائے۔ تو کیا مسلم قوم کی اجتماعی قوت زندہ ہو سکتی ہے۔

مورخ وعلم النفس کے ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ قومی ترقی وعروج کے لئے کسی عقیدہ کا ہونا ضروری ہے اور جس قوم کا عقیدہ جس قدر راسخ ہوگا اسی قدر اس میں قوت زیادہ ہوگی۔ مثلاً مذہب اسلام کے ابتدائی زمانہ کو لیجئے کہ عرب کے ان جاہلوں میں وہ کونسی قوت تھی جس کی وجہ سے۔ روم۔ یونان اور ایشیاء کی تمام اقوام لرزہ براندام تھیں۔ اور فتح وکامرانی ان جاہلوں کے ارادہ کے ساتھ چلتی تھی۔ میرے خیال میں ان تمام اشخاص یا قوم میں صرف عقیدہ کی قوت کام کر رہی تھی۔ یعنی ان کو بتلایا گیا تھا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ خدا کے حکم سے کر رہے ہو۔ اور اگر تم شہید ہوگئے تو تم کو جنت ملے گی۔ اور جنت میں تم کو یہ آرام وآسانیاں ملیں گی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ جاہل موت کو تلاش کرتے تھے۔

اور موت ان سے گریز کرتی تھی۔ آج آپ جنت و دوزخ کو فرضی نام بتلاتے ہیں۔ مگر اسوقت اس فرضی نام میں ہی یہ قوت تھی کہ انھیں فرضی اعتقادات کے تحت لاکھوں انسانوں نے اپنی جانوں کو متاع حقیر خیال کیا۔ ابتک آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اسکا یہ جواب دیں کہ وہ صرف تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ہے۔ جاہلوں سے اسکا کوئی واسطہ نہیں مگر آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ جب کسی عقیدہ یا اُصول مذہبی میں بحث و دلیل شروع کر دیجائے اور عوام کو مشاہدات و احساسات کی روشنی میں عقیدہ یا اُصول کی پرکھنے کی عادت ڈالدیجائے۔ تو پھر نہ اُصول باقی رہتا ہے نہ عقیدہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدنی ترقی کے اسباب مفقود ہوجاتے ہیں اور قوم پر ایک قسم کا جمود طاری ہو کر دور وحشت لوٹ آتا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ عقیدہ یا ایمان کو جب تک عقل سلیم قبول نہ کرے۔ انسان کیونکر تقلید گوارا کر سکتا ہے۔ میری رائے میں آپ کا یہ مشورہ صحیح نہیں ہے۔

دنیا میں جب کبھی قومی انقلابات ہوتے ہیں۔ تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ ان انقلابات میں کتنے انشاپرداز۔ اڈیٹر۔ منطقی و فلاسفر شامل ہوتے ہیں غالبًا اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ انقلابات کے بانی صرف مذہبی لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے اصول و اعتقادات اور ان کی حمایت میں اپنی جانوں کو بیدریغ قربان کیا۔ آج بھی آپ روزانہ کا عمل دیکھ رہے ہیں کہ آپ کسی واقعہ کو مذہبی رنگ دیکر سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی قربانی کرا دیجئے۔ برخلاف اس کے آپ کسی منطقی دلیل سے کسی ایک انسان کی بھی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے۔ چنانچہ آج بھی آپ کو ہر قوم میں لاکھوں آدمی ایسے مل سکتے ہیں جو اپنے اُصول و اعتقادات کے تحت اپنی جانوں کو بیدریغ قربان کر سکتے ہیں۔ حالانکہ آپ ان اُصول و اعتقادات کو مجموعہ خرافات خیال کرتے ہیں۔

میرے خیال میں کسی قوم کی اجتماعی اور تمدنی ترقی کے لئے کسی اُصول وعقیدہ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ خواہ وہ اصول یا عقیدہ صحیح ہو یا غلط۔ کیونکہ بغیر اس کے کامیابی ہونا ناممکن ہے۔ اگر بقول آپ کے تمام اسلامی عقاید مثل جنت دوزخ۔ معجزات۔ کتب الہامی۔ معراج و حیات بعد الموت۔ وغیرہ جن سب سے آپ کو انکار ہے۔ اگر آج ان کل عقاید کو کل دنیا کے ہر مسلمان غلط قرار دیدیں تو پھر یہ بتلایئے کہ ان غلط عقاید کے مقابلہ میں آپ کونسا صحیح عقیدہ یا حل پیش کرتے ہیں۔ جس سے وہ تمام فواید جو ان عقیدوں سے اب تک حاصل ہوئے ہیں، آیندہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ کسی عقیدہ کے قوت و نفوذ کو وہی عقیدہ ضعیف کر سکتا ہے۔ جو قوت و نفوذ میں اُس کے برابر ہو۔ اس بنا پر ایمان کا دشمن ایمان ہی ہو سکتا ہے۔ رہا یہ امر کہ مولوی۔ مُلاں عقیدہ یا اُصول سے ناجایز فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور گمراہی پھیلاتے ہیں اور اُنھوں نے اس کو ذہنی معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ تو جناب والا اس کے لئے خواہ کتنی ہی کوشش کریں۔ یہ طبقہ برابر فائدہ اُٹھاتا رہیگا اور کوئی دلیل یا منطق ان کو اس فعل سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جب تک مثل ایران۔ ٹرکی اس طبقہ پر پابندیاں عاید نہ کر دیجاویں۔ اور ان کو خود حلال کی روزی کمانے پر قانونًا مجبور نہ کر دیا جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اب تک آپ نے جو کچھ اعتقادات و اُصول کے خلاف تحریر فرمایا ہے۔ وہ اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے۔ کہ ۹۰ فیصدی غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو معتقدات پر سختی سے عامل ہے اور جو اس کے موروثی عادات کا جزو ہو گئے ہیں۔ اور جن کے تمام اعمال میں معتقدات سرایت کر گئے ہیں ان کو غلط راستہ پر ڈالدیا جائے اگر آپ ان کو بھی صحیح راستہ بتانا چاہتے ہیں تو مہربانی فرما کر اس خام ایمان کے مقابلہ میں کوئی پختہ ایمان تجویز فرمائیے۔ جو ان کی ذہنیت اور ماحول کے مطابق ہو۔

دنیا آپ کی تخریبی پروگرام سے تو واقف ہو چکی ہے۔ اب تعمیری پروگرام کا انتظار کر رہی ہے۔ فقط

(نگار) آپ کی تحریر کا خلاصہ غالباً صرف اس قدر ہے کہ:۔

۱۔ رسم و رواج یا اعتقادات کا وجود قومی ترقی کے لئے ازبس ضروری ہے اور

۲۔ عقاید کو علم یا عقل کی روشنی میں دیکھنا اجتماعی زندگی اور تمدنی ترقی کے مانع ہے۔

اور انھیں دو بنیادی اُصول پر آپ نے محاکمہ کرتے ہوئے میری مذہبی آزادی کو مضرت رساں اور جہلاء کے عام عقاید کو مفید ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس باب میں آپ کا غلو اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ خالص قرآنی تعلیم کو بھی آپ کافی نہیں سمجھتے۔ گویا بہ الفاظ دیگر آپ کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز صرف یہی تھا کہ وہ حشر و نشر دوزخ و جنت وغیرہ کے قایل تھے اور اگر اب ان کو اس عقیدہ سے ہٹایا جائے گا تو وہ یقیناً گمراہ ہو کر اپنی قومی و اجتماعی زندگی تباہ کر لیں گے۔

آپ کے اس بیان میں نظر بہ واقعہ و حقیقت جتنا اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اور بہ لحاظ نتیجہ آپ کا استدلال جس درجہ نادرست ہے، افسوس ہے کہ وکیل ہونے کی حیثیت سے بھی آپ کی نگاہ اس پر نہیں گئی، اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کا کیا ذکر ہے۔

میرے عزیز دوست افسوس ہے کہ آپ نے اس مسئلہ پر غور کرنے سے قبل اعتقاد اور معتقدات کے فرق و امتیاز کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ ایک چیز "اعتقاد" ہے یعنی وہ کیفیت یقین جو ہمارے نفس میں پائی جاتی ہے اور دوسری چیز "معتقدات" یعنی وہ مسایل جن سے ہماری کیفیت یقین متعلق ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

پھر یہ تو آپ بھی کہتے ہیں کہ اعتقاد نام ہے ایک ایسے یقین کا جس میں ادنیٰ شائبہ ریب و شک کی گنجایش نہیں لیکن شاید اس حقیقت کی طرف آپکی نگاہ نہیں گئی کہ یقین نام ہے اس کیفیت کا جو استدراک و شعور کے ماتحت نفس انسانی میں پیدا ہوتی ہے ۔ اس لئے آپ کا "یقین کی منزل" کو عقل و استدلال کی دسترس سے باہر سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا آپ کا کسی ملزم کی صفائی میں عدالت کے سامنے یہ کہدینا کہ اس نے

جرم کیا ہے اور اسی لئے اس کو سزا نہ ملنی چاہئے۔

بہر حال درجاتِ یقین میں کوئی پست ترین درجہ بھی ایسا نہیں ہے جو بغیر شعورِ نفس کی مدد کے حاصل ہوجائے اور چونکہ قوتِ شاعرہ بڑی حد تک تربیت و ماحول، اسباب و حوادث خارجی سے متاثر ہوتی رہتی ہے اس لئے یہ ضرور نہیں کہ ہر زمانہ میں ہر ملک و قوم کا شعورِ نفس ایک ہی طرح کا ہو۔ ذوق و وجدان کے اس اختلاف کی صراحت بیکار ہے کیونکہ اس سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ وہی ایک چیز جو میرے لئے قابلِ قبول ہے آپ کے لئے نہیں، اور جو آپ کے نزدیک واضح نہیں ہے وہ میرے لئے کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ بہر حال آپ کا یہ کہنا کہ مذہب و اعتقاد کے باب میں عقل و شعور کو درخورِ حاصل نہیں! اصولاً و طبعاً بالکل غلط ہے۔ ایک بُت پرست اگر پتھر کی مورتی کو پوجتا ہے تو اس کیفیتِ شعور کے ساتھ کہ واقعتاً وہی اس کے مقاصد کو پورا کرنے والی ہے اور آپ خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں تو بھی اس احساس کے ساتھ کہ وہی مستجاب الدعوات ہے۔ اس لئے جس حد تک "اعتقادِ محض" کا تعلق ہے، کفر و اسلام میں کوئی فرق نہیں، لیکن "معتقدات" کے باب میں تمام مذاہب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہیں سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ یہ اختلاف حقیقتاً شعور و ادراک کا اختلاف ہے، استدلال و استنتاج کا اختلاف ہے، عقل و طبائع کا اختلاف ہے اور اس لئے آپ کا یہ کہنا کہ "معتقداتِ مذہب" کو علم و عقل سے علٰحدہ رکھنا چاہئے نفسیاتی اُصول کے لحاظ سے بالکل ناقابلِ عمل اور داعیاتِ فطرتِ انسانی کے بالکل منافی ہے۔

یہ درست ہے کہ کسی قوم کی ترقی و عروج کے لئے کسی نہ کسی عقیدۂ راسخ کا پایا جانا بالکل ضروری ہے، کیونکہ جب تک کوئی غرضِ مشترک نہ ہو اجتماعی مرکزیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس اُصول کو سامنے رکھ کر آپ یہ کیونکر ثابت کرسکتے ہیں کہ وہ عقیدۂ راسخ جو ترقی کا ضامن ہوسکتا ہے اسلام کے سوا کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔

آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ عرب کے جاہلوں کی بیداری اسلام ہی کی ممنون بھی اور ہوسکتا ہے کہ ان کا یہ تمام جوش و ولولہ صرف اس عقیدہ کی بنا پر ہو کہ انھیں مرنے کے بعد "حور مقصورات فی الخیام" مرحمت ہوں گی۔ لیکن کیا میں اپنے فاضل دوست سے پوچھ سکتا ہوں کہ اسلام سے پہلے جتنی قومیں ترقی کرچکی تھیں کیا وہ سب انھیں معتقدات کی قائل تھیں جو اسلام نے پیش کئے اور اب جو ممالک ترقی کررہے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرح حیات بعد الممات، حشر و نشر اور دوزخ و جنت کے قائل ہیں۔ بحث کا یہ پہلو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ آپ ہی کی تحریر کے مطابق ترقی و عروج کا مفہوم صرف فتوحاتِ دنیاوی قرار پاتا ہے، ورنہ شاید میرا طریق بحث اس سے زیادہ نازک و دقیق ہوتا۔ خیر، تو مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قوموں

کی ترقی کے لئے اتحاد خیال و عقیدہ یقیناً ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ عقیدہ وہی ہو جو اسلام نے پیش کیا ہے۔
آپ نے جاہل عربوں کی فتوحات کا تو ذکر کیا، لیکن میدیوں اور کلدانیوں کے عروج، یونان و روما کی فتوحات، قدیم مصریوں کی شوکت و جبروت، ہند و چین کی دولت و ثروت اور موجودہ عیسوی قوموں کے ارتقاء کو نظر انداز کر گئے۔ کیا ان سب کے معتقدات وہی تھے جو اسلام نے پیش کئے اور کیا تاریخ میں بت پرست قوموں کی فتوحات و ترقی کا حال آپ کی نگاہ سے نہیں گزرا۔ پھر آپ کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کی ترقی کا سبب صرف اُن کے معتقدات تھے درست نہیں۔ کیونکہ ان معتقدات کے علاوہ دوسرے عقاید کے ماننے والوں نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں ترقی کی اور آیندہ بھی جب آسمانی مذاہب کا خیال بھی لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے گا، ترقی کا دروازہ بدستور کھُلا رہیگا اور ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ پانے کی اسی طرح کوشش کرتی رہیگی۔

آپ کا یہ ارشاد بھی بجا و درست ہے کہ دنیا کے انقلابات میں انشا پردازوں، اڈیٹروں، منطقیوں اور فلاسفروں نے کوئی حصہ نہیں لیا اور بقول آپ کے یہ مذہب ہی کی کورانہ تقلید کا نتیجہ تھا کہ لاکھوں آدمیوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں، لیکن معاف فرمایئے، اگر مذہب کا مدعا واقعی صرف کشت و خون ہے اور جان لینا اور جان دیدینا ہی اس کا حقیقی مقصود ہے تو شاید انشا پردازوں، اڈیٹروں اور فلسفیوں کو بانیانِ مذاہب کی زندگی پر غبطہ کرنے کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوگی۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست　!

اس قدر بیان سے غالباً دو باتیں آپ پر واضح ہو گئی ہوں گی۔ ایک یہ کہ اعتقاد و معتقدات ایک دوسرے سے بالکل جُدا دو چیزیں علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں اور دوسرے یہ کہ اجتماعیت کا اصل راز صرف اشتراک خیال ہے، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو۔ پھر کیا یہ بات آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ کورانہ عقیدہ تو انسان کی ترقی کا باعث ہو جائے اور وہ عقیدۂ راسخ جو علم و تجربہ کے بعد پیدا ہو، انحطاط و زوال کو مستلزم ہو۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

معاف فرمایئے، آپ نے شروع ہی سے نفس مذہب اور خصوصیت کے ساتھ تعلیمات اسلام کا مفہوم بالکل غلط قرار دیا ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ انسانی ترقی نام ہے صرف توسیع حکومت و سلطنت کا اور چونکہ یہ بغیر جنگ و جدل کے ممکن نہیں اس لئے آپ کے نزدیک وہی مذہب سب سے بہتر ہے جس نے سب سے زیادہ خونریزی کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بدنصیب ہے وہ مذہب جس کی حمایت کرنے والے ایسی خوں آشام ذہنیت رکھتے ہوں اور لایق صد ہزار تحسین ہے وہ لامذہبیت جو انسانی ترقی کا معیار صرف ذہنی و اخلاقی عروج پر قایم کرنے والی ہو ــــــــ رسول اللہ کا دعویٰ تو یہ تھا کہ اسلام دنیا میں امن و سکون

قائم کرنے کے لئے آیا ہے، انسان کو "نفس مطمئنہ" کی اس لذت سے آشنا کرنا چاہتا ہے جو مادی دُنیا سے ماورا، صرف اخلاق کی دنیا سے متعلق ہے اور اسی لئے بانی اسلام کو "رحمۃ اللعالمین" کے لقب سے یاد کیا گیا، لیکن آپ یہ فرماتے ہیں کہ نہیں اسلام نام ہے صرف اُن معتقدات کا جنھوں نے مسلمانوں کو خونریزی پر آمادہ کیا اور چونکہ آپ کے پندار کے مطابق مسلمانوں ہی نے زیادہ خونریزی کی ہے اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی کو یہ دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے کہ اس سے زیادہ سچا مذہب اور کوئی نہیں۔

آپ نے یہ بھی دریافت فرمایا ہے کہ اگر

"تمام اسلامی عقاید مثل جنت، دوزخ، معجزات، کتب الہامی، معراج، وحیات بعد الموت وغیرہ جن سے آپ کو انکار ہے، آج اگر ان عقاید کو کل دنیا کے مسلمان غلط قرار دیدیں تو پھر یہ بتائیے کہ ان غلط عقاید کے مقابلہ میں آپ کونسا صحیح عقیدہ پیش کرتے ہیں جس سے وہ تمام فوائد حاصل ہوں جو ان عقیدوں سے اب تک حاصل ہوئے ہیں"

اس کے جواب میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر موجودہ عقاید کے فوائد وہی ہیں جنھوں نے بقول آپ کے روم و یونان کی اقوام کو لرزہ براندام کر دیا تھا اور جو انسانوں کو اپنی جان دینے پر آمادہ کر دیتے تھے، تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اس لحاظ سے ہلاکو اور چنگیز کے عقاید کیا بُرے تھے۔ لیکن اگر مذہب کا تعلق حریت فکر و رائے سے بھی ہے تو پھر سوال عقاید جہلا کی پیروی کا نہیں بلکہ ان کی اصلاح کا ہوا کرتا ہے اور اہل علم کو محض اس خیال سے خاموش نہ بیٹھ رہنا چاہئے کہ عوام کو ان کے عقاید سے ہٹانا دشوار ہے۔ اگر دوزخ و جنت یا حیات بعد الممات کا عقیدہ انسان کو آمادۂ عمل کر سکتا ہے تو اس عقید کا انکار بدرجۂ اولیٰ جد و جہد پر آمادہ کرنے کی اہلیت اپنے اندر رکھتا ہے، کیونکہ اُس صورت میں تو سب کچھ "وعدۂ فردا" پر منحصر ہے اور اس صورت میں معاملہ "نقد سودے" کا ہے۔

آپ کو علم نہیں، مجھ سے پوچھئے کہ اس وقت تعلیم یافتہ ممالک میں مذاہب کی طرف سے کیسی عام بیزاری پیدا ہو رہی ہے اور مذہبیت کے خلاف کیسی سخت باضابطہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ نفس مذہب سے ان کو عناد ہے بلکہ اس کی وجہ وہی عقاید کی لغویت ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اگر کوئی مذہب قایم رہ سکتا ہے تو صرف وہی جو اپنے عقاید کے لحاظ سے ترقی علم کا ساتھ دے اور ایسا پروگرام دنیا کے سامنے پیش کرے جو باوصف اختلاف نسل و رنگ ساری دنیا کو ایک مرکز پر لے آنے والا ہو۔

اگر آپ نے گزشتہ ماہ کا نگار ملاحظہ فرمایا ہے تو مجھے بتائیے کہ ملاحظات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو ناقابل عمل سمجھنے میں آپ کے پاس کیا دلایل ہیں اور اگر اسلام کا وہی مفہوم قرار دیا جائے جو اس میں ظاہر کیا گیا ہے تو کیا

کسی فرشتۂ عذاب کے نازل ہونے کا اندیشہ ہے ۔ آپ اس کے جواب میں کہیں گے کہ اسلام کی تعلیم تو وہ نہیں ہے جو اس میں ظاہر کی گئی ہے۔ میں کہوں گا کہ سوائے اس کے کوئی اور مقصد اسلام کا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ تاریخ اسلام سے استدلال کریں گے، میں تعلیم اخلاق کو پیش کروں گا، یعنی آپ مسلمانوں کا حال دیکھ کر اسلام کا مفہوم متعین کریں گے، اور میں اسلام کے مفہوم سے مسلمانوں کا جایزہ لوں گا۔ آپ فرمائیں گے کہ اسلام نام ہے دوزخ وجنت کے عقیدہ کا، میں عرض کروں گا کہ اسلام کا مدعا صرف نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے، ان عقاید سے کوئی تعلق نہیں ۔ پھر ممکن ہے کہ اس "تو تو میں میں" میں آپ کامیاب ہو جائیں کیونکہ آپ ٹھیرے مسلمان جس کے نزدیک جان دیدینا اور لے لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن جس وقت سوال صلح و آشتی کا پیدا ہوگا اور اسلام کو ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت ہوگی، تو اس وقت آپ کی یہ جنگجویانہ تعبیر بیکار ثابت ہوگی (کیونکہ میدان جنگ و جدل میں بھی اس وقت وہی قومیں آپ سے زیادہ کامیاب ہیں جو جنت و دوزخ وغیرہ کے عقاید کو بالائے طاق رکھ چکی ہیں۔) اور آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مذہب کے لئے یہ امر کبھی وجہ افتخار نہیں ہو سکتا کہ اس نے جہلا کو ان کے جہل پر برقرار رکھا بلکہ اس کا سب سے بڑا فخر یہ ہونا چاہیئے کہ اس نے ذہنی ترقی کے لئے نئی نئی راہیں کھولدیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مذہب، علم و عقل کو مشعل راہ نہ بنائے ۔

جنوری ۳۶ء کے نگار

میں کیا ہوگا

ہندی شاعری کی مفصل تاریخ ۔ ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب ۔ اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات ۔ برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ ۔ برہن شاعری کے بے مثل نمونے ۔ ہندی کے عاشقانہ رنگ کے عجیب و غریب دوہے ۔ ہندوستان کی گوپیوں کی شاعری ۔

قیمت فی پرچہ دو روپیہ ۔ نگار کے سالانہ خریداروں سے کچھ نہیں ۔ نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے ۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

ادب و انشا کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیفہ و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی ۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات ۔ کاغذ دبیز ۔ قیمت معہ محصول ۱۲/ ۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے ۔

منیجر نگار - لکھنؤ

باب الاستفسار

فارسی زبان اور طنزیات

(جناب سید فضل الدین صاحب - دھرمپور)

میں (Satire) پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں اور اس سلسلہ میں مجھے فارسی کی طنزیہ شاعری کا مطالعہ کرنا ہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس کے لئے کیا تدبیر اختیار کروں۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کا ایک مضمون اس موضوع پر نکل چکا ہے، لیکن اسکا تعلق زیادہ تر اُردو سے ہے۔ تمہید و مقدمہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ بسیط نہیں اور فارسی زبان کی طرف تو کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی، امید ہے کہ جلد سے جلد جواب دینے کی زحمت گوارا کی جائے گی۔

(نگار) فارسی میں "طنزیہ شاعری" ایک خاص صنعت کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر اسی میں ہجو کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر یہ دفتر اتنا وسیع نظر آتا ہے کہ شاید ہی کسی دوسری زبان کی شاعری اس کا مقابلہ کر سکے۔

اس موضوع پر آپ کو کوئی خاص تصنیف تو ملیگی نہیں، البتہ اگر آپ شعرا رفارس کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں گے تو کافی ذخیرہ ہاتھ آجائے گا۔ مہرجی بھائی نوشیرواں جی کوکا ام۔ اے نے انگریزی میں فارسی لطائف وظرائف پر ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں بعض مثالیں طنزیہ شاعری کی بھی دی ہیں، اسے ملاحظہ فرمائیے چند یہیں درج کئے دیتا ہوں، جن سے معلوم ہوگا کہ صرف انداز بیان کی نُدرت سے کیسی پاکیزہ صورتیں ہجو وطنز کی پیدا کی گئی ہیں:۔

ا۔ خواجہ نصیر کو کسی امیر نے کافر کہدیا تھا۔ اس نے جلکر دو شعر کا ایک قطعہ لکھا جو شاعر و امیر دونوں سے

زیادہ مشہور ہوا اور ابتک دنیا میں موجود ہے۔ لکھتا ہے:۔

نظام بے نظام ار کافرم خواند چراغ کذب را نبود فروغے
مسلماں خوانمش زیرا کہ نبود سزاوار دروغے جز دروغے

بدتمیز امیر نے مجھے کافر کہا حالانکہ جھوٹ کا چراغ عرصہ تک روشن نہیں رہتا۔ بہرحال میں اُس کو مسلمان ہی کہوں گا کیونکہ جھوٹ کا جواب جھوٹ ہی ہوا کرتا ہے۔

۲۔ بالکل اسی انداز کا ایک قطعہ کمال الدین اسماعیل کا بھی ہے ملاحظہ ہو:۔

گر خواجہ بہر ما بدی گفت ما چہرہ زغم نمی خراشیم
ما غیر نکوئی اش نگوئیم تا ہر دو دروغ گفتہ باشیم

اگر خواجہ نے مجھے بُرا کہا تو رنج کی کیا بات ہے، میں اسے اچھا کہوں گا تاکہ دونوں کا جھوٹ برابر کا رہے

۳۔ جمال الدین اصفہانی کو کسی رئیس نے شراب تحفتاً بھیجی جو اُسکے لئے بہت ہلکی تھی اور اُسے پسند نہیں آئی اس نے چار شعر کا ایک قطعہ لکھ کر جن الفاظ میں شکریہ ادا کیا ہے، وہ سننے کے قابل ہیں:۔

اے کریمے کہ دام منت را کرم و بخشش تو دانۂ ماست
از تو مارا شکایتے ست لطیف واں نہ از تست کز زمانۂ ماست
آں چہ مے بود کم فرستادی کہ ہمہ شہر پُر فسانۂ ماست
اگر آنرا شراب شاید خواند چاہِ ما پس شرابخانۂ ماست

یعنی یہ آپ نے کیسی شراب بھیجی کہ اگر واقعی اس چیز کا نام شراب ہوسکتا ہے تو میں اپنے گھر کے کنوئیں کو کیوں نہ شراب خانہ کہوں، جس میں ہر وقت ایسی شراب موجود رہتی ہے۔

۴۔ شہاب ترشیزی نے کسی کی ہجو میں دو شعر لکھے ہیں بیان کا ارتقار ملاحظہ ہو:۔

زبہر تاختن در وادی ہجو سمندِ طبع را چوں رام کردم
ترا خر خواندم و گشتم پشیماں کہ آں بیچارہ را بدنام کردم

یعنی تجھے خر کہا اور یہ کہکے پشیمان ہوا کہ ناحق بیچارے گدھے کو بدنام کیا۔

۵۔ ایک بار مولانا جامی کو کسی شاعر نے غزل سنائی جو نہایت مہمل تھی لیکن اس میں التزام اس بات کا تھا کہ حرف (الف) کہیں نہیں پایا جاتا تھا۔ شاعر نے اس صنعت کی طرف مولانا جامی کو خاص طور سے توجہ دلائی انھوں نے جو داد دی ہے وہ سننے کے قابل ہے:۔

شاعرے خواند پُر خلل غزلے کیں بہ حذفِ الف بود موصوف

گفتمش نیست صنعتے بہ ازاں	کہ کنی حذف ازاں تمام حروف

یعنی اگر الف کے ساتھ ہی غزل کے سبھی حروف حذف کر دئے جاتے تو زیادہ مناسب تھا۔

۶ --- تاج الدین سرخسی نے کسی ظالم شخص کی موت پر ایک رباعی لکھی تھی، اس کی طنزیہ شان ملاحظہ ہو:-

در ماتمت آں قوم کہ خوں می بارند	مرگ تو حیات خویش می پندارند

غمناک ازانند کہ تا دوزخیاں	جاوید چگو: با تو صحبت دارند

یعنی تیرے ماتم میں جو لوگ خون کے آنسو بہا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تیرے مرنے کا انہیں افسوس ہے کیونکہ تیری موت تو حقیقتاً اُن کی زندگی ہے۔ بلکہ غم اس بات کا ہے کہ اہل دوزخ تیرے ساتھ دائمی زندگی کیونکر بسر کر سکیں گے۔

۷ --- کمال الدین اسماعیل نے کسی بخیل کا حال ایک رباعی میں لکھا ہے۔ اور انداز بیان میں عجیب مزاح پیدا کیا ہے لکھتا ہے:-

بر دہن نان خواجہ چوں بردم	خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم

گفتمش خواہ میر و خواہ میر	کہ من ایں لقمہ را فرو بُردم

میں نے خواجہ کے دستر خوان پر روٹی کا نوالہ توڑ کر منھ میں رکھا تو وہ بولا کہ "آہ میں مر گیا" میں نے اُس سے کہا کہ اب تو مرے یا جئے، میں تو اس لقمہ کو نگلے بغیر مانتا نہیں،

۸ --- عبد العلی طوسی نے بھی ایک رباعی میں کسی بخیل کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

اے کاسۂ تو سیاہ و دیگِ تو سفید	از آتش و آب ہر دو بریدہ امید

آں شستہ نمی شود مگر در باراں	ویں گرم نمی شود مگر از خورشید

یعنی تیرا سیاہ پیالہ اور تیری سفید دیگ دونوں آگ اور پانی سے بالکل بے نیاز ہیں، کیونکہ پیالہ اگر کبھی دُھلتا ہے تو بارش کے پانی سے اور دیگ اگر کبھی گرم ہوتی ہے تو صرف دھوپ میں۔

۹ --- ہجو میں مبالغہ کی ایک نہایت دلکش مثال میرزا ابو قاسم شیرازی کے اس قطعہ میں پائی جاتی ہے:-

بہ فلاں گفتم اے پسر پدرت	جز بتاریکی از چہ ناں نخورد

گفت ترسد ز روشنی کہ مباد	سایہ اش دست سوئے کاسہ برد

میں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کیا بات ہے تیرا باپ جب کھانا کھاتا ہے تاریکی میں۔ اس نے کہا کہ وہ روشنی سے اس لئے گھبراتا ہے کہ مبادا اس کا سایہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دے۔

۱۰ --- مولانا شہاب الدین کسی طبیب سے جس کا نام اصیل تھا خفا ہو گئے تو اس کی ہجو میں ایک قطعہ لکھا:-

ملک الموت از اصیل طبیب	می بنالید بدرگاہ خدائے

کہ جہاں را ز خلق خالی کرد | اندریں دور گم شدہ سر و پاے
یا ازیں شغل دور کن او را | یا مرا خدمتِ دگر فرمائے

یعنی فرشتۂ موت خدا کے حضور میں رو رو کر عرض کر رہا تھا کہ اقتیل طبیب نے تو دنیا خالی کر دینے پر کمر باندھ رکھی ہے اس لئے یا تو اس کے لئے کوئی اور پیشہ تجویز کر یا مجھے کسی اور خدمت پر مامور فرما۔

۱۱۔۔ کمال الدین اسماعیل کو اس کے خواجہ نے کچھ غلّہ عنایت کیا جو اچھا نہ تھا۔ اس نے تین شعر کا قطعہ شکایت میں لکھا۔ ملاحظہ ہو:۔

غلہ کامسال داد خواجہ مرا | گر نہ بُد جملہ بود اکثر خاک
نسبت خاک و گندمش باہم | ہمچناں بد کہ تخم اندر خاک
خاک مردم خورد، ندانستم | کہ خورد مردم اے برادر خاک

امسال خواجہ نے مجھے غلہ عنایت کیا جو اگر سب کا سب مٹی نہ تھا تو اس کا اکثر حصہ ضرور مٹی تھا، اور اسمیں گیہوں اور مٹی کی نسبت بالکل وہی تھی جیسے مٹی اور تخم کی ہوتی ہے۔ میں سنا کرتا تھا کہ مٹی انسان کو کھاتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ کبھی کبھی انسان بھی مٹی کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

۱۲۔۔ کاتبی نیشاپوری کو کسی امیر کی طرف سے کوئی سالانہ امداد مقرر تھی لیکن وہ اتنی کم تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ چنانچہ ایکبار اس نے شکایت لکھ بھیجی کہ:۔

خسروا از خورد و پوشِ من نداری آگہی | چوں نباشد سر دم از تو نالہ و افغاں مرا
نیستم کعبہ کہ در سالے دہی یک جامہ ام | یا نیم گردوں کہ روزے بس بود یک ناں مرا

یعنی تو جو میرے کھانے پینے کی طرف سے غافل ہے تو شکایت نہ کروں تو کیا کروں، بندہ نواز، میں کوئی کعبہ تو ہوں نہیں کہ سال میں صرف ایک لباس میرے لئے کافی ہو اور نہ آسمان ہوں کہ روزانہ صرف ایک روٹی پر (کنایہ ہے آفتاب کی طرف) قناعت کر لوں۔

۱۳۔۔ کمال الدین اسماعیل کو کسی رئیس نے گھوڑا مرحمت کیا، لیکن شاعر کے پاس خود اسی کے لئے اسباب معیشت تنگ ہوتے ہیں وہ گھوڑے کو کیا کھلاتا۔ اس نے اس واقعہ کو ایک نہایت لطیف مکالمہ کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے:۔

دی اسپ مرا گفت کہ دایں چہ تنگ ست | کاصطبل ترا از نا دیہا ہے فلک ست
نے آب دراں نہ سبزہ نے کاہ نہ جو | ایں جائے ستور نیست جائے ملک ست

کل میرے گھوڑے نے مجھ سے کہا کہ تیرا اصطبل اس دنیا کی چیز تو ہے نہیں ممکن ہے کوئی آسمانی

چیز ہو۔ نہ اس میں پانی ہے، نہ سبزہ، نہ گھاس ہے، نہ جو اس لئے یہاں بجائے گھوڑے کے تو کسی فرشتہ کو لاکر باندھ، میں یہاں کیا کروں گا۔

۱۴۔ رشدی سمرقندی نے وزیر کی مدح میں قصیدہ کہا لیکن کوئی صلہ اس کو نہ ملا۔ اس نے خفا ہو کر دو شعر اور لکھے

تو وزیری و منت مدحت گوئے — دستِ من بے عطا روا بینی

تو وزارت بمن سپار و مرا — مدحت گوئے تا عطا بینی

تو وزیر ہے اور میں تیرا مدح گو لیکن مفلس و محتاج۔ تو وزارت میرے سپرد کر اور میری تعریف میں قصیدہ لکھ تو پھر میں بتاؤں کہ انعام و صلہ کیونکر دیا جاتا ہے۔

۱۵۔ عبید زاکانی اپنے افلاس کا حال لکھتا ہے:۔

در خانۂ من زینک و بد چیزے نیست — جز بنگے و پارۂ نمد چیزے نیست

از ہر چہ پزند نیست غیر از سودا — وز ہر چہ خورند جز لگد چیزے نیست

میرے گھر میں سوائے بھنگ اور کمل کے ٹکڑے کے اور کوئی چیز نہیں۔ پکانے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف "سودا" اور کھانے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف "لات"۔

۱۶۔ اسیری نے کسی بخیل امیر کے دسترخوان کا حال نہایت لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

ترا اے خواجہ کز امساک برخواں — ز نعمتہائے الواں ہیچ اثر نیست

چو مہ بر نطعِ گردوں سفرہ ات را — شب از یک گردۂ ناں بیشتر نیست

دلے ہر کو شکست آں گردۂ ناں — اگر چہ دانم آں حد بشر نیست

کند گر دعوئے اعجاز شاید — کہ ایں معجز کم از شق القمر نیست

اے خواجہ تیرا دسترخوان آسمان سے کم نہیں کہ وہاں بھی چاند کی صرف ایک روٹی ہے اور یہاں بھی ایک اس لئے اگر کوئی شخص تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے (جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں) تو اس کا دعوئ اعجاز غلط نہ ہوگا کیونکہ اس کا تیرے دسترخوان پر روٹی توڑنا گویا چاند کے دو ٹکڑے کرنا ہوگا۔

ڈراما اصحاب کہف

ابھی طیار نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کوئی صاحب ابھی اس کا آرڈر نہ دیں یہ ڈراما ۳۱ جنوری ۳۶ء کے بعد شایع ہوگا۔ اور صرف انھیں حضرات کو مل سکے گا جو نگار کے خریدار ہیں — جو اصحاب اس کی قیمت بھیج چکے ہیں وہ اسے واپس لے سکتے ہیں اگر اتنا انتظار انھیں گوارا نہ ہو۔

منیجر نگار لکھنؤ

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں				ناول، ڈرامے اور افسانے				تاریخ و سوانحعمریاں		لغات و ادب	
گوڈر کا لال	للعہ	فرائض مادری	۱۲ر	قطرات اشک	عمہ	موہنی	۱۲ر	تاریخ مغرب	عا	بازاری زبان	۸ر
شوکت آرا بیگم حصہ ۱و۲	ے	افسانہ نادر جہان	عہ	جنت نگاہ	عہ	وداع ظفر	عہ	مختصر تاریخ اسلامی	۸ر	لغات سعیدی	للعہ
" حصہ سوم	ے	اقبال دلہن	عہ	بس کا روگ	عہ	یاسمین شام	عمہ	" " حصہ ۲	۹ر	لغات کشوری	ے
سعیدہ کے خطوط	عہ	حسن معاشرت	عمہ	فسانۂ سعید	۸ر	طوفان اشک	عہ	" " حصہ ۳	۱۰ر	گنجینۂ تحقیق مجلد	للعہ
پیاری سہیلی	۱۰ر	ایامی	عمہ	خوفناک ڈکیتی	عمہ	شاہین و دراج	۸ر	" " حصہ ۱	عہ	منتخب اللغات فارسی	عا
نئی نویلی پیاری سہیلی	عمہ	سولہ کہانیاں	۱۲ر	سیلاب اشک بالتصویر	عمہ	درس عشق	عمہ	الصالحات	عہ	محاورات نسواں	۸ر
عورتوں کی انشا	عہ	سترہ کہانیاں	۱۲ر	بے زبان دوست	۶ر	گرداب حیرت	عمہ	امت کی مائیں	عہ	جواہر اللغات	۱۴ر
انشاء نسواں	۸ر	سولہ قصے	۸ر	جمال ہمنشین	۱عہ	تین بندوق باز	عمہ	الزہرا	۱۲ر	گوہر اللغات	۱۴ر
سیرۃ الکبریٰ	۱۴ر	مرأۃ العروس	۸ر	تفسیر عصمت	عہ	کرشمہ رقابت	۸ر	اسوۂ حسنہ	۸ر	چراغ سخن	عہ
طرز زندگی حصہ ۱و۲	عا	بنات النعش	۸ر	جوہر قدامت	عمہ	انقلاب قسطنطنیہ	۸ر	ہندو شعراء	عمہ	دکھنی لغت	۸ر
مخدرات تیموریہ	عا	توبۃ النصوح	۱۲ر	تائید غیبی	۸ر	شاہد رعنا	عمہ	[illegible]	عہ	جواہرات کلیات نظیر	عمہ
ازواج النبی	۱۲ر	کنیز فاطمہ	۸ر	پراسرار قتل	عا	دنیا کی سرگذشت	۱۴ر	سوانح اکبر الہ آبادی	عہ	عزیز اللغات	عا
ازواج الانبیا	عہ	[illegible]	۸ر	اعلان آزادی	۵ر	شگوفۂ محبت	۷ر	سفرنامہ عراق	عہ	تذکرہ ریختی	عہ
سیرۃ عائشہ صدیقہ	عا	نصیحت کا کرنپھول	۸ر	سرگذشت ہاجرہ	۱۰ر	نسوانی زندگی	۸ر	تاریخ افاغنہ	عمہ	تاریخ اردو دور قدیم	عمہ
عفت المسلمات	عمہ	برکات سلطانی	۸ر	زہر زندگی	۱۲ر	ولایتی ننھی	۸ر	اسلام اور غیر مسلم	۸ر	دکن میں اردو	۵ر
سبیل النجات	عا	ابن الوقت	عہ	قلب حزین	۸ر	شمع خاموش	۸ر	سیر المصنفین حصہ ۱	عا	منتخب کلام شہیدی	عا
بچوں کی پرورش	عہ	چند پند	۱۴ر	عروس کربلا	عمہ	شب زندگی کامل	عا	" حصہ ۲	ہے	رباعیات عمر خیام	عا
حفظ طفلان	عہ	منتخب الحکایات	۱۴ر	شہید مغرب	عہ	موودہ	۸ر	تاریخ اسلام ۵ جلد	عہ	منتخب کلام ہندی	عا
تہذیب نسواں	عا	تندرستی	عہ	ناظم	عمہ	سیندر کلا	۸ر	اخبار الاندلس ۳ جلد	عا	اردو کے اسالیب بیان	عا
بیوی کی تعلیم	عمہ	حفظ صحت	عہ	تیغ کمال	عہ	گلستان خاتون	عمہ	خلافت موحدین	للعہ	تفریح الاغلاط	۱۴ر
بیوی کی تربیت	عہ	طبیب نسواں	عمہ	سراب مغرب	۸ر	صبح زندگی	عہ	خلافت مولدین	عا	مفصل اردو	۵ر
تربیت اطفال	۱۲ر	رہبر صحت	۸ر	منازل السائرہ کامل	عا	شام زندگی	عہ	عرب اور اسکا مستقبل	عہ	نور اللغات ۴ جلد	للعہ

دواوین فارسی						دواوین اردو					
دیوان شمس تبریز	عمہ	کلیات غالب	عمہ	دیوان غنی کشمیری	۶ر	کلیات ظفر	عا	کلیات نظیر اکبر آبادی	عہ	صنمخانۂ عشق	عا
کلیات عراقی	۱۴ر	کلیات صائب	عمہ	دیوان ہلالی	۱۴ر	کلیات مومن	عمہ	گلزار داغ	عمہ	فریاد داغ	عمہ
دیوان حافظ	عمہ	دیوان ناصر علی	۱۴ر	اسرار خودی و رموز	ے	دیوان ناسخ	عمہ	دیوان رند	۱۲ر	عالم خیال بالتصویر	عہ
دیوان بیدل	عمہ	کلیات سعدی	عمہ	زبور عجم	ہے	کلیات میر	عہ	دیوان ذوق	۱۴ر	دیوان شہیدی	۱۴ر
دیوان عرفی	۱۴ر	کلیات حزین	عمہ	پیام مشرق	ہے	کلیات سودا	عہ	گلکدۂ عزیز	عہ	کلیات اکبر الہ آبادی	للعہ
کلیات جامی	عا	دیوان عنصری	۱۴ر	قصائد عرفی مجلد	ہے	کلیات انشا	عہ	مرأۃ الغیب	عہ	نغمۂ دل شاہجہانپوری	عمہ

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم
- شب معراج
- سراج منیر
- پیغمبر عالم
- سوانح حضرت رسول
- سید المرسلین
- حیدر کرار
- سیرۃ الصدیق
- عمر ابن خطاب
- ابوبکر صدیق
- ائمہ اسلام
- الحبیب
- عمر بن عبدالعزیز
- دولت فاطمیہ
- مکمل سوانح زیب النساء بیگم
- تذکرہ اولیا
- تذکرہ اولیائے ہند
- مراۃ الکونین
- قصص الانبیا مکمل
- سفرنامہ چین
- تلخیص التاریخ
- خاتون جنت
- مخدرات الصوفیہ
- خواتین نگورہ
- مشاہیر نسوان
- مشاہیر ہند
- مخدرات تیموریہ
- بیگمات بنگال

جاسوسی کی ناول

- شرلاک ہومز
- محاصرہ پیرس
- شیخ چلی
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- بحری قزاق
- عراقی جاسوس
- ٹرکی حرم سرا
- جنگ طرابلس
- بہرام جدید
- زر پرست
- کنجی کا راز
- عبدالرحمن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- نازنین مراکش
- سمندر کی سیر
- اسرار بالشویزم
- روح لیلی
- امین بک
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی
- بہرام کی سرگذشت

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس کامل
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دلگیر

عجائب غرائب

- عجائب مخلوقات: تصویر رنگین / بلاتصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانہ عالم

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- السدین ولیلی
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روزا لیمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- حرم سرا

ناول سجاد حسین

- احمق الذی
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

ناول جوالا پرشاد

- مرزانالی
- مار آستین
- بنگالی دولہن
- معشوقہ فرنگ
- پرتاب
- زدہنی

ناول سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی
- سوانح عمرو عیار

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- مشاطۂ سخن
- مکاتیب محسن الملک

تذکرۃ الشعراء

- تذکرہ حسینی
- گلشن بیخار
- سراپائے سخن
- سوانح نظیر اکبرآبادی

ناول شرر

- جنید بغدادی
- مخدرات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- مینا بازار
- مقدس نازنین
- رومتہ الکبریٰ
- فلپانا
- شوقین ملکہ

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- رسائل شبلی
- موازنۂ انیس و دبیر
- کلام شبلی اردو
- الکلام
- علم الکلام
- شعر العجم جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- 〃 چہارم
- 〃 پنجم

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ہر قسم کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴